فہرست

لمعات

آیئے خود کو قرآن کے آئینے میں دیکھیں	محمد سلیم اختر	3
مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ)	غلام احمد پرویز	5
برہمنیت، پاپائیت اور اِسلام	منصور سرمدی	20
درود کا دینی مفہوم	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	30
إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ	چوہدری محمد آفتاب عروج	37
صلوٰۃ بحیثیت قرآنی نظام	غلام باری، مانچسٹر	46

ENGLISH SECTION

WAR AND PEACE

By Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہم نے اپنے اس کالم میں ملک میں تعلیم کے شعبے میں تیار کئے گئے نصابی مواد کا جائزہ لے کر ان میں شامل خلافِ قرآنی اصولوں کے نظریات کی نشاندہی قرآن کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کی جامعات میں نصابی کتب کے جائزے کے سلسلے میں قارئین کی توجہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی حالیہ شائع شدہ برائے ایم۔اے علوم اسلامیہ' علوم القرآن کے نام سے ایک ضخیم کتاب بطور نصاب طلباء وطالبات کی راہنمائی کے لئے' کی طرف دلانا مقصود ہے۔

مرتبین علوم القرآن برائے ایم۔اے اسلامیہ نے وحی اور قرآن کے عنوان کے تحت صفحات 79-78 میں طلباء کی راہنمائی میں وضاحت کی ہے کہ:

وحی صرف قرآن میں نہیں

منکرین سنت وحی کو صرف قرآن تک محدود رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک سنت پر وحی کا اطلاق نہیں ہوتا' بلکہ وہ اسے آنحضرت ﷺ کی ذاتی رائے اور تدبیر واستنباط کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ جب کہ قرآن وسنت سے اس نقطہ نظر کی تردید ہوتی ہے۔ درحقیقت آنحضرت ﷺ پر نازل ہونے والی وحی دو اقسام پر مشتمل ہے۔

1-3 وحی متلو وغیر متلو یا وحی جلی وخفی

وحی کی وہ قسم ہے جسے آنحضرت ﷺ پر خاص الفاظ اور معانی دونوں کے ساتھ اتارا گیا ہے جو اصول وکلیات پر مشتمل ہے اور قرآن کی صورت میں اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور جس میں معمولی لفظی تغیر بھی ممکن نہیں۔ اسے وحی متلو یا 'وحی جلی' بھی کہا جاتا ہے۔

اس کی تلاوت وقرأت کا تاکیداً حکم ہے اور اس پر اجر وثواب کا وعدہ ہے۔ دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن حکیم کے اصول وکلیات کی تشریح وتوضیح اور شرعی احکامات کی جزوی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس میں مضامین تو من جانب اللہ ہوتے ہیں جب کہ الفاظ کا انتخاب' رسول اکرم ﷺ کا ہوتا ہے جسے وحی غیر متلو یا 'وحی خفی' بھی کہا جاتا ہے یعنی جس کی تلاوت

کا باقاعدہ حکم نہیں دیا گیا اور یہ وحی بھی چاہے الہام والقاء کے ذریعے حاصل ہو یا نبی کی فہم وفراست اور اجتہاد کا نتیجہ ہو بہرحال شیطانی تحریکات واثرات سے منزہ اور غلطی اور خطاء سے یکسر پاک ہوتی ہے اور جس کے وحی ہونے کی سند خود قرآن نے دی ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى o إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى o(53:3-4)۔

(ترجمہ درج نہیں کیا گیا' لیکن سہولت کے لئے درج کئے دیتے ہیں) اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے۔ یہ تو وحی ہے جو اس (رسول) پر اتاری جاتی ہے۔

اور اس کی وضاحت آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ:

انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ۔ (ابوداؤد۔سنن ابوداؤد' کتاب السنّت' باب فی لزوم السنۃ)۔

''مجھے قرآن اور اس جیسی دوسری تعلیمات عطا کی گئی ہیں''۔

اس میں مثلہ سے مراد وحی کی یہی دوسری قسم ہے۔

جو لوگ وحی کو صرف قرآن حکیم میں منحصر سمجھتے ہیں وہ قرآن حکیم کی نفی کرتے ہیں کیونکہ قرآن حکیم کی متعدد آیات اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ سنت یا اقوال وافعال رسول وحی ہیں۔ اگرچہ ان دونوں اقسام کے درمیان باہمی مراتب کے اعتبار سے یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ قرآن لفظاً ومعناً وحی ہے جب کہ حدیث کے معانی ومضامین وحی ہیں''۔

حدیث کے معانی ومضامین کو وحی کے درجہ میں نہ رکھنے والوں پر مرتبین زیر تبصرہ کتاب نے تنقید کرتے ہوئے صفحات 800-799 میں درج کیا ہے کہ:

اردو میں..... تحقیق کے نام پر آزاد خیال طبقہ نے قرآن حکیم کی اپنے مزعومہ نظریات وعقائد اور خواہشات کے مطابق تشریح وتعبیر شروع کی اور اسے بازیچہ اطفال بنا دیا۔ برصغیر میں اس کی ابتداء سرسید احمد خاں سے ہوئی۔

یہاں پھر مرتبین نے اپنی تنقید میں درج ذیل نکات اٹھائے۔

(1) سرسید نے سائنس اور مذہب میں تطبیق پیدا کرنے کے لئے مخلصانہ کوششیں کیں مگر جو توجیہات انہوں نے پیش کی ہیں وہ راسخ العقیدہ اور مستند علمی حلقوں میں ناقابل قبول ہیں۔

(2) سرسید کے انہی اصولوں کے زیر اثر عبداللہ چکڑالوی اور علامہ اسلم جیراجپوری وغیرہ نے انکار حدیث کی راہ

ہموار کی۔

(3) بعد ازاں اسی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے غلام احمد پرویز 1985ء نے سنت کی حجیت اور اس کی تشریعی حیثیت کا سرے سے انکار کر دیا۔

(4) غلام احمد پرویز نے (احادیث کی مدد لئے بغیر) قرآن کی تفسیر خود قرآن اور لغت کی روشنی میں پیش کی۔

(5) انہوں نے جمہور سے الگ ایک اور مکتب فکر کی بنیاد رکھی جو 'اہل قرآن' کے مزعومہ نام سے موسوم ہے۔

(6) پرویز کے نظریات امت مسلمہ کے متفق نظریات سے متصادم ہیں اس لئے انہیں علمی حلقوں میں مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔

(7) مقبولیت کے برعکس پرویز کے خلاف ''تصانیف کا اتنا بڑا ذخیرہ مرتب ہوا جو ایک مستقل کتب خانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرتبین زیر تبصرہ کتاب نے جس طرح تحقیقی، علمی اور منطقی انداز تحقیقی اور تنقید کے اصولوں کو نظر انداز کئے ہوئے بلا دلیل عمومی انداز میں یہ نکات اٹھائے ہیں، ہم انہیں تبصرہ کا اہل نہ پاتے ہوئے بھی تبصرہ کرنے پر اگر مجبور ہوئے ہیں، تو صرف اور صرف اس وجہ سے کہ مرتبین اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے ایم۔اے کے طلباء کو علمی درس دینے کی بجائے مناظرانہ، تنگ نظری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

لہٰذا نہایت اختصار سے مرتبین ہی کے پیش کردہ ترتیب وار نکات کا قرآن کی روشنی میں تبصرہ پیش کرنے کے لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

(1) سرسید احمد خاں کی سائنس اور مذہب میں تطبیق کا ناقابل قبول ہونا:

سرسید احمد خاں نے اسلام کی دوسرے مذاہب کے تقابل میں سچائی ثابت کرنے کا معیار کا پیمانہ قرار دیا کہ اس میں کوئی بات قانون فطرت (سائنس) کے برخلاف نہ ہو۔ لہٰذا اس نے تفسیر قرآن میں اس کی حقانیت کے ثبوت میں یہ نظریہ پیش کیا کہ قانون فطرت درحقیقت خدا کا فعل (Work of God) ہے اور قرآن خدا کا قول (Words of God) ہے۔ پس اس کے فعل اور قول میں مطابقت ہونی ضروری ہے کیونکہ دونوں کا ماخذ ایک ہی (واحد) ہے۔

اسلام کی نمائندگی میں چونکہ سرسید نے قرآن مجید کو اپنی بحث کا موضوع قرار دیا ہے۔ مجموعہ احادیث وغیرہ کو اس بحث سے الگ رکھا۔ تکنیکی طور پر تو یہ امر راسخ العقیدہ حلقوں میں ناقابل قبول نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ احادیث کا وحی غیر متلو

ہونے کی بنا پر ان کے عقیدہ کے مطابق اللہ کا قول یعنی Words of God کے زمرے میں شامل ہونے کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا' کیونکہ وہ لفظاً و معناً وحی میں شامل نہیں بلکہ معانی و مضامین وحی ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی' اپنی کتاب حیات جاوید' آئینہ ادب' لاہور' 1966ء کے صفحہ 238 میں البتہ امت کے نام نہاد علماء کی وضاحت کرتے ہوئے درج کرتے ہیں کہ:

''جس طرح بعضے چالاک وکیل کسی حیلے سے جج کو فریق مخالف پر افروختہ کر کے اپنا کام نکال لیتے ہیں اسی طرح ان مولویوں نے اپنی تفسیروں کے خریدار پیدا کرنے کا یہ گر نکالا ہے کہ سرسید کو کہیں شیطان کا منکر' فرشتوں کا منکر' کہیں معجزات کا منکر' کہیں نبوت کا منکر' کہیں جنت و دوزخ کا منکر قرار دے کر مسلمانوں کو ان سے اور ان کی تفسیر سے نہایت بدگماں اور متنفر کر دیا ہے''۔

(2) محترم عبداللہ چکڑالوی اور علامہ اسلم جیراجپوری کا انکارِ حدیث:

محترم عبداللہ چکڑالوی اصول و کلیات سمیت اس کی جزئیات تک بھی قرآن سے اخذ و استنباط کرنے کا نظریہ رکھتے تھے اور ایک جدید فرقہ ''اہل قرآن'' کے نام سے وجود میں لے آئے تھے۔ ان کو سرسید احمد خاں' اسلم جیراجپوری اور غلام احمد پرویز کے مسلک سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نظریات خصوصاً تین نماز کا جواز قرآن سے نکالنا اور اردو میں نماز کی ادائیگی کا جائز قرار دینا' محترم پرویز صاحب کی شدید تنقید کا نشانہ بنے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے ان کے اس عقیدہ کی بنا پر بھی کہ وہ جزئیات کے اخذ کے لئے صرف قرآن کریم کو سند اور ماخذ خیال کرتے تھے' ان سے اور ان کے فرقہ ''اہل قرآن'' سے لاتعداد مواقع پر لاتعلقی کا اظہار کیا ہے اور ان کی بھرپور مخالفت کی ہے۔ اس کے باوجود مرتبین زیر تبصرہ کتاب کا محترم پرویز صاحب کا الگ مکتبہ فکر کی بنیاد ان کے حساب سے مزعومہ نام سے موسوم ''اہل قرآن'' رکھنے کے تصور کو ان سے منسلک کرتے ہیں۔ ایک مہذب معاشرہ میں بے بنیاد الزامات سے کسی بھی فرد کی عزت کی ہتک کرنا جرم تصور ہوتا ہے۔ اس جرم کی نوعیت مزید سنگین ہو جاتی ہے' جب وہ سرکاری مجاز اتھارٹی کے نام سے کی جا رہی ہو۔

دوسرے صاحب محترم اسلم جیراجپوری کا مقامِ حدیث کے متعلق نظریہ محترم سرسید احمد خاں اور محترم غلام احمد پرویز سے مطابقت رکھتا ہے۔ محترم اسلم جیراجپوری پر انکارِ حدیث کے الزام کا اطلاق شاید مرتبین صاحبان ان کے حدیث کے وحی غیر متلو ہونے کے عقیدہ سے مخالفت کی بنا پر لگا رہے ہیں۔ احادیث کے وحی غیر متلو ہونے کی سند میں زیر تبصرہ علوم القرآن میں قرآن سے ایک ہی آیت کا حوالہ دلیل میں دیا گیا ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى oإِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى o(53:3-4)۔

اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے۔ یہ تو وحی ہے' جو اس (یعنی رسول) پر اتاری جاتی ہے۔

قرآن کی اس آیت سے احادیث کو وحی غیر متلو کے درجہ میں رکھنے کا مرتبین اصحاب کے استدلال سے البتہ علامہ اسلم جیراجپوری نے اپنے مقالہ علم حدیث میں اختلاف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

''اس (آیت) سے مرتبین کا استدلال) کہ لہٰذا' رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو نکلتا تھا سب وحی تھا' حقیقت فہمی سے بہت دور ہے۔ کیونکہ اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے اس کلام کا جو بذریعہ وحی کے اترتا تھا اور جس سے کفار کو انکار تھا اور وہ صرف قرآن ہے (جیسا کہ زیرِ تبصرہ کتاب کے صفحہ 168 میں بھی صرف قرآن ہی کی وضاحت درج ہے)۔ آنحضرت ﷺ خانگی امور میں ازواجِ مطہرات سے یا عام معاملات میں دوسرے لوگوں سے رات دن گفتگو فرماتے تھے' اس کے وحی ہونے کا نہ دعویٰ تھا نہ اس کے متعلق کوئی بحث تھی۔ مخالفت صرف قرآن کی تھی اور وہی بذریعہ وحی کے نازل کیا گیا تھا' جس کی تصریح اس میں ہے۔

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (6:19)۔

اور میری طرف سے یہ قرآن اتارا گیا ہے کہ میں تم کو اس کے ذریعہ آگاہ کروں اور ان کو بھی جن تک یہ پہنچے۔

دوسری جگہ ہے:

قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالْوَحْيِ (21:45)۔

کہہ دے کہ میں تم کو صرف وحی کے ذریعہ سے آگاہ کرتا ہوں۔

حصر ہے کہ سرمایۂ انذار صرف قرآن ہے اور وہی لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے وحی کیا گیا ہے۔ اسی کو آنحضرت ﷺ نے لکھوایا اور لوگوں کو یاد کرایا۔ بعض لوگوں نے وحی کی دو قسمیں کر ڈالی ہیں۔ متلو اور غیر متلو یا جلی و خفی۔ ایک کو قرآن کہتے ہیں' ایک کو حدیث۔ لیکن یہ ان کی محض خیالی اصطلاح ہے جس کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں۔ حدیثیں بھی اگر وحی تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو قرآن کی طرح لکھوایا کیوں نہیں''۔

کسی پر بھی الزام لگاتے وقت چارج شیٹ میں اس کے موقف کا ذکر کیا جاتا ہے' جس کی بنا پر الزام لگایا جاتا ہے۔ مرتبین نے شاید سہواً اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لہٰذا ان کے موقف کو سامنے لایا جا رہا ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوری نے اپنی کتاب ''ہمارے دینی علوم'' میں علم حدیث پر سیر حاصل بحث کے بعد اس ضمن میں اپنے نظریہ کا لب لباب یوں پیش کیا ہے۔

(1) قرآن دین کی مستقل کتاب ہے اور اجتماعی اور انفرادی ہر لحاظ سے ہدایت کے لئے کافی ہے۔ وہ انسانی عقل کے سامنے ہر شعبہ حیات میں اتنی روشنی رکھ دیتا دیتا ہے کہ وہ اس کے نور میں اللہ کی مرضی کے مطابق کام کر سکے۔

(2) اس کی عملی تشکیل رسول اللہ ﷺ نے خود فرما دی ہے جو امت کے لئے اسوہ حسنہ ہے اور اس میں تواتر کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔

(3) عمل بالقرآن کا زمانہ عہد رسالت و خلافت راشدہ تک ہے جس کے بعد مستبد سلاطین کے تسلط سے دینی لامرکزیت اور انفرادیت آ گئی۔ اس عہد کی کوئی بات خواہ وہ حدیث ہو' خواہ فقہ' دینی حجت نہیں ہے۔ ہاں قرآن یا اسوہ حسنہ کے مطابق ہونے پر قبول کی جائے گی۔ حدیث کا صحیح مقام ''دینی تاریخ'' ہے اور فقہ کا ''ہنگامی اجماع یا قیاس''۔

آپ علامہ اسلم جیراجپوری سے اختلاف کر سکتے ہیں' لیکن حدیث کے قبول ہونے میں قرآن اور اسوہ حسنہ کے مطابق شرط لگانے سے منکر حدیث کے خطاب سے نوازنے کے لئے دلائل نہیں رکھتے جبکہ درایت کے اصولوں کے مطابق اس شرط کے علاوہ اور بھی کئی شرائط تمام نصابی کتب میں شامل ہیں۔

(3) محترم پرویز پر سنت کی حجیت اور اس کی تشریعی حیثیت سے انکار۔

محترم پرویز صاحب کے افکار کا ترجمان طلوع اسلام 1938ء سے شائع ہو رہا ہے۔ رسول کے اسوہ حسنہ پر محترم پرویز صاحب نے اپنے موقف کو طلوع اسلام کے مقصد کے عنوان کے ساتھ تواتر سے بیان کر رہے ہیں۔ موجودہ سن 2008ء کے شماروں کے سرِ ورق پر بھی ان کا موقف ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ:

> ''نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ' شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوہ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی اور یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ

حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرمﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو''۔

اس واضح موقف کی موجودگی میں سنت کی حجیت سے یکسر انکار کا الزام لگانے کے لئے دلائل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے' جو یہاں پیش نہیں ہوئے۔ ان کی غیر موجودگی میں صرف الزام لگانے سے طلباء کی راہنمائی نہیں ہوتی بلکہ علمی زبان میں ان کو گمراہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

(4) قرآن کی تفسیر خود قرآن اور لغت کی روشنی میں محترم پرویز کی روش۔

مرتبین نے کتاب زیر تبصرہ میں محترم پرویز صاحب پر تنقید کی ہے کہ انہوں نے قرآن کی تفسیر خود قرآن اور لغت کی روشنی میں پیش کی۔ اس میں البتہ یہ درج نہیں کیا کہ اس روش میں کیا قباحت ہے۔ اس روش کے اعتراف میں خود محترم پرویز صاحب نے اپنی کتاب مفہوم القرآن کے تعارف میں اپنے موقف کی وضاحت کی ہے کہ:

(1) عربی زبان کی مستند کتب لغت و تفاسیر کی مدد سے' قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی' پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ متعین کئے جائیں' اور اس کے لئے جہاں تک پیچھے جاسکتے ہوں' جائیں' تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نزولِ قرآن یا اس سے قریب تر زمانہ میں ان الفاظ سے بالعموم کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

(2) پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم نے ان الفاظ کو کن کن معانی میں استعمال کیا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک بات کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے' اور ان تمام مقامات کو بیک وقت سامنے لانے سے' ان الفاظ کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

(3) علاوہ ازیں جن الفاظ کو قرآن کریم نے بطور اصطلاحات استعمال کیا ہے' ان کا مفہوم بھی قرآن کریم سے متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ ان جامع اصطلاحات سے' اپنی تعلیم کے کس قسم کے تصورات (Concepts) پیش کرتا ہے۔

قرآن کی تفسیر خود قرآن سے اور (قرآن کے الفاظ کی) لغت کی روشنی میں کرنے کی روش میں محترم پرویز صاحب کا واضح موقف ہے۔ اس موقف سے اختلاف کا جواز نہیں ملتا' جب کہ خود قرآن سے تصریف الآیات کی مدد سے اور عربی زبان کی لغات سے نزول قرآن کی زبان سے مطالب نکالنے کی روش کی تلقین میں قرآن سے خود وضاحت ملتی ہے۔ تصریف آیات کی مدّ میں یوں کہ:

انظُرُ كَيْفَ نُصَرِّفُ الآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُونَ (6:65)۔

دیکھو' ہم کس طرح آیات کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تا کہ لوگ اچھی طرح بات سمجھ سکیں۔

زیرتبصرہ کتاب کے صفحہ 198 میں درج ہے کہ تفقہ فی القرآن میں مدد کے لئے اللہ نے بنیاد تصریفِ آیات کے ساتھ فرمائی ہے۔

اسی طرح تفسیر سے عربی لغت سے مدد لینے کی روش کی وضاحت میں قرآن کا ارشاد ہے' کہ قرآن اتارا ہی عربی زبان میں ہے۔ اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

(1) حُكْماً عَرَبِيّاً (13:37)۔

(2) قُرْآناً عَرَبِيّاً (12:1)۔

(3) لِّسَاناً عَرَبِيّاً (46:12)۔

(5) جمہور کی فکر سے ایک مزعومہ فرقہ ''اہل قرآن'' کا محترم پرویز پر بنیاد رکھنے کا الزام۔

مزعومہ فرقہ ''اہل قرآن'' کی بنیاد پرویز صاحب پر رکھنے کا الزام بالکل غلط ہے اور محترم پرویز صاحب ان کے موقف سے متفق نہیں تھے۔ اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے' یہ الزام سرے ہی سے بے بنیاد اور حقیقت سے بعید ہے۔

(6) محترم پرویز صاحب کے نظریات کا امت مسلمہ سے متصادم ہونے کی بنا پر نا قابلِ قبول ہونا۔

محترم پرویز صاحب کی فکرِ قرآنی پر قرآن کی روشنی میں تنقید کی جگہ اکثر یہی گھسے پٹے الفاظ سننے میں ملتے ہیں کہ وہ جمہور سے الگ' امتِ مسلمہ سے متصادم سوچ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہی وجہ کافی ہے کہ ان کو رد کر دیا جائے دلائل و براہان کو علم کی کسوٹی پر پرکھنے کی جگہ' اپنے زمانہ میں رائج معتقدات کی روشنی میں پرکھنے کی روش کی قرآن سے تلقین نہیں ملتی' بلکہ اس کے برخلاف وعید حاصل ہوتی ہے کہ:

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللّهِ إِن يَتَّبِعُونَ إِلاَّ الظَّنَّ (6:116)۔

روئے زمین کے اکثر لوگ (جمہور کی اکثریت) ایسے ہیں کہ اگر تو ان کی بات مانے گا تو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں۔

اب جہاں تک امت سے متصادم نظریات کا قابل قبول نہ ہونا ہے، تو یہ دلیل قرآن کے طالب علم کے لئے سند نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے بڑے واضح انداز میں امت کی آراء کو انسان پر مسلط کرنے کی مخالفت کی۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (2:134)۔

یہ امت تھی جو گذر چکی۔ جو انہوں نے کیا تھا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لئے ہے اور اس کے متعلق تم سے باز پرس نہ کی جائے گی جو وہ کرتے تھے۔

علم کی تحقیق کے لئے البتہ باز پرس کا درج ذیل اصول قرآن نے دیا ہے اور اس کی پیروی محترم پرویز صاحب نے کی ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُولًا (17:36)۔

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً تمہاری سماعت و بصارت اور دل (Mind) ''یعنی انسان کے اپنے ذرائع علم'' سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔

لہٰذا، قرآن کی اس حتمی اور دوٹوک وضاحت سے مرتبین کو طلباء کی راہنمائی میں یہی اصول سامنے رکھنا چاہئے۔

(7) محترم پرویز کے خلاف ذخیرہ کتب خانہ مرتب ہونا۔

مرتبین نے محترم پرویز صاحب کے خلاف ذخیرہ کتب خانہ کی اشاعت کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انہوں نے محترم پرویز صاحب کے موقف کے خلاف الزامات لگائے ہیں، وہ انہی سے متاثر ہو کر لگائے ہوں گے۔ الزامات کی امداد کے لئے دلیل و برہان کی عدم موجودگی اور مرتبین کی طرف سے محترم پرویز صاحب کے خلاف ذخیرہ کتب کے ماخذ کی تفصیل بیان نہ کرنا اور اس کے باوجود طلباء کی راہنمائی کا دعویٰ کرنا، مضحکہ خیز ہی محسوس ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرتبین طلباء کی راہنمائی کے کم اور اپنی معاش کے بندوبست اور اس کے جواز میں فتویٰ صادر کرنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اسی لئے انہوں نے زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ 209 میں ایک حدیث درج کی ہے اور ساتھ اس کی وضاحت بھی یہ بیان کی گئی ہے۔

(من قرأ القرآن یتاکل به الناس جاء یوم القیامة و وجهه عظم لیس علیه لعم)۔ (شعب الایمان' التاسع عشر من شعب الایمان' باب فی تعظیم القرآن' 532:2)

''جس شخص نے لوگوں سے کھانے پینے کی غرض سے قرآن کی تلاوت کی وہ قیامت کے دن اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے چہرے پر ہڈیاں اور گوشت نہ ہوگا''۔

اس حدیث سے زیرِ تبصرہ کتاب میں شاید یہی مطلب اخذ کیا ہے کہ قرآنی تعلیمات سے مالی منفعت کا حصول جائز نہیں۔ حدیث کے درج میں تحقیقی اصولوں کے مطابق اصلی متن اور پھر حوالہ بھی دیا گیا ہے' لیکن اس سخت وعید سے بچاؤ کے لئے مصنف نے تحقیقی اصولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مخصوص حوالہ جات دیئے بغیر یوں وضاحت کی ہے۔

''البتہ قرآن مجید کے ذریعے جائز حاجات میں دعا مانگنا اور بیماریوں میں اس کے ذریعے جائز علاج کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ (بغیر حوالے کے) سے ثابت ہے۔ اسی طرح مدرسین قرآن (مرتبین' خود بھی ان میں شامل ہیں) کی تنخواہیں خواہ مدارس میں ہوں یا سرکاری اداروں میں جائز ہیں جیسا کہ صحابہ کرامؓ کے دور سے اس پر عمل چلا آ رہا ہے۔

مرتبین کی وضاحت میں جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جائز حاجات میں دعا مانگنا اور بیماریوں میں قرآن سے تلاوت کے ذریعے علاج کرنے کا جائز ہونا ہے' اسے علمی نظریہ میں شمار نہیں کیا جاتا ہے اس قسم کے عقائد تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں' جو مذہب کے نام پر لوگوں سے رقم بٹورنے کا ذریعہ ہے یہاں صرف یہ کہنے سے کہ یہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور حوالہ میں نہ ہی احادیث کا یا کسی دوسرے ماخذ کے درج کرنے کی ضرورت کا احساس نہ کرنے کو علمی روش سے خارج اور تبصرہ کے لائق نہیں گردانا جاتا۔

سہولت کی اسی وضاحت کے دوسرے پیرے میں مدرسین قرآن کا قرآن کی تلاوت سے تنخواہیں حاصل کرنے کے جواز میں صحابہ کرامؓ کے تعامل کے حوالے سے سرسری ذکر کافی سمجھا گیا ہے۔ تعامل کی تائید میں اگر صحیح احادیث موجود نہ ہوں' تو اسے قابلِ قبول ہونے کی سند حاصل نہیں رہتی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بھی وضاحت سے محاضرات حدیث کے صفحہ 158 میں درج کیا ہے کہ:

تعامل کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں میں رائج بھی ہو اور اس دور کے اور ہر دور کے متدین اہل علم' شریعت اور قرآن وسنت کا علم رکھنے والے اس کو درست سمجھتے ہوں' یہی وہ تعامل ہے جو تواتر کی

ایک قسم ہے' بشرطیکہ احادیث صحیحہ سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ ورنہ بیسیوں قسم کی گمراہیاں ہیں' جو مسلمانوں میں پھیل گئی ہیں۔

یہاں مرتبین کا ایک حدیث کا درج کرنا جس سے تلاوت قرآن سے منفعت کے لئے سخت وعید سنائی گئی ہو اور اپنے ہی پروفیشن کے حق میں تعامل کے نام پر ان کا جواز نکالنا اور وہ بھی صحیح حدیث کی مدد کے بغیر' ان کے لئے سوچ کا مقام رکھتا ہے کہ کہیں وہ ایم۔اے اسلامیات کے طالب علموں کے لئے ڈاکٹر محمود احمد غازی کے الفاظ میں گمراہی کا سامان تو پیدا نہیں کر رہے۔

تلاوت قرآن سے منفعت کے حصول میں سخت وعید کی بشارت پر مشتمل حدیث کے درج کرنے کے علاوہ' مرتبین نے زیر تبصرہ کتاب کے ص 208 میں اسی وعید کی تائید میں قرآن کی درج ذیل آیت کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس آیت پر غور و فکر بھی مرتبین کی راہنمائی کرنے میں کافی ہے کہ تلاوت قرآن سے جو لوگ اپنے آپ کو وارثِ کتاب ہونے کا حق بتلاتے ہوئے' اس سے دنیائے دنی کا مال ومتاع کے حصول کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں' وہ قرآن کے الفاظ میں کہیں ''ناخلف'' کی قسم میں شمار ہونے کے اہل تو نہیں ہو جاتے۔

''حامل قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے میں پوری طرح مخلص ہو اور اسے دنیوی مفادات کا ذریعہ نہ بنائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُواْ الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ هَـذَا الأدْنَى (7:169)۔

پھر ان کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے جو کتاب کے وارث بنے۔ یہ بلا تامل اس دنیائے دنی کا مال ومتاع وصول کر لیتے ہیں''۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ (۳۰/۳۲)۔

غلام احمد پرویزؒ

فِرقۂ اہلِ قرآن

کی پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا تجزیہ

ملک کی مقتدر جامعات سے منسلک شعبہ اسلامی علوم سے وابستہ اصحاب میں محترم پرویز صاحب کے ''رجعت الی القرآن'' کی تلقین سے غلط فہمی کی بنا پر ان کو فرقہ اہلِ قرآن سے منسلک کرتے ہیں۔ یہ سوچی سمجھی سکیم ہے یا پھر غلط فہمی کی بنا پر ہے' اس کی تفصیل میں جائے بغیر ہم یہاں محترم پرویز کا ''اہل قرآن کے مسلک پر'' تجزیہ دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ اس کی پہلی دفعہ اشاعت طلوع اسلام کے ماہنامے میں جون ۱۹۷۵ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی اداروں کی اس مقالہ کی طرف رسائی نہیں ہوئی۔ لہٰذا' ہم اب ان سے توقع رکھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ طلباء کی راہنمائی میں اپنے نظریہ کی تصریح کر کے محترم پرویز صاحب پر غلط الزام لگانے سے اجتناب کریں گے۔ **(ادارہ)**

فِرقۂ اہلِ قُرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں

قرآن کے نام پر۔۔۔قرآن سے دشمنی

☆☆☆

میں شروع ہی میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ (۱) نہ میرا تعلق کسی فرقہ سے ہے' نہ ہی میں نے کوئی اپنا فرقہ کھڑا کیا ہے۔ میں' قرآن کریم کی رو سے' فرقہ بندی کو شرک سمجھتا ہوں۔ (۲) نماز' روزہ وغیرہ جملہ ارکان اسلام کی ادائیگی عام مسلمانوں کی طرح کرتا ہوں۔ کسی فرد یا فرقہ کو ان میں تغیر و تبدل کا مجاز نہیں سمجھتا۔ نہ ہی کسی نئے طریق کے وضع کرنے کا مختار۔ (۳) تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ و عظمتِ قرآن کریم میرا جزو ایمان اور زندگی کا مشن ہے۔ جہاں ان پر کسی قسم کی زد پڑتی ہے' اس کی مدافعت میرا تقاضائے ایمان اور دینی فریضہ ہوتا ہے۔ (۴) ہمارے زمانے میں ناموسِ رسالت ﷺ کو سب سے زیادہ نقصان تحریک ''احمدیت'' نے پہنچایا اور عظمتِ قرآن کو (نام نہاد) ''اہل قرآن'' نے۔ (۵) فرقہ اہل قرآن کو چنداں

اہمیت حاصل نہیں۔ یہ چند گنتی کے نفوس پر مشتمل ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اب یہ اپنی گمراہی کے دامن کو وسیع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کا نوٹس لینا بھی ضروری خیال کیا ہے۔ (۶) میرے اس مقالہ کے مخاطب' اس فرقہ کے ذمہ دار افراد نہیں کیونکہ تجربہ نے بتایا ہے کہ لیڈری کی ہوس انسان میں ایسا پندار نفس پیدا کر دیتی ہے جو ان کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیتا ہے۔ میرے مخاطب وہ سعید افراد ہیں جو ان کی باتوں پر' نہایت نیک نیتی سے یہ سمجھ کر کان دھرتے ہیں کہ یہ قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ' حقیقت کے سامنے آ جانے کے بعد' غلط راستہ چھوڑ کر' صحیح راہ اختیار کر لیں۔ (۷) میرا مقصد ان لوگوں سے کسی بحث میں الجھنا نہیں کیونکہ اس کے لئے میرے پاس فالتو وقت ہی نہیں۔ نہ ہی میں ذاتیات پر اتروں گا کہ علمی گفتگو میں ذاتیات پر اتر آنا پستی فطرت کی دلیل ہوتا ہے۔ میں ذاتیات پر اترا ہی نہیں کرتا۔ میں اپنی زندگی کے باقی ایام کو خدمتِ قرآن کے تعمیری مقصد کے لئے وقف رکھنا چاہتا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد اصل موضوع کی طرف آیئے۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو سفرِ حیات میں اس کی راہنمائی بھی اپنے ذمے لی۔ اس راہنمائی کے لئے طریق یہ اختیار کیا گیا کہ خدا اس کا علم' وحی کے ذریعے' ایک برگزیدہ ہستی کو عطا کر دیتا اور وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتی۔ اس برگزیدہ ہستی کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔ اس راہنمائی کا انداز کیا تھا' اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ خود انسانی زندگی کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ کس اصول کے تابع باقی رہتی اور آگے بڑھتے ہے۔ یہ اصول ہے ''ثبات وتغیر کا امتزاج''۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ جس کا تعلق انسان کی طبیعی (یعنی جسمانی) زندگی سے ہے۔

ثبات وتغیر کا امتزاج

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعی زندگی کا دارومدار (منجملہ دیگر عوامل) غذا پر ہے۔ اسے زندگی کے پہلے سانس سے لے کر نفسِ آخرین تک غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس غذا کی نوعیت اور طور طریق حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ زمانہ کے اعتبار سے دیکھئے تو تاریخ کے دور اول کے جنگلوں اور غاروں میں بسنے والے انسانوں کی غذا کی نوعیت کچھ اور تھی اور عصر حاضر کے انسان کی کچھ اور۔ پھر ایک ہی فرد کی عمر کے مختلف ادوار اور جسمانی حالت کو سامنے رکھئے تو اس کی غذا کی نوعیت میں تغیر ضروری ہوگا۔ پیدائش کے بعد بچے کی غذا صرف دودھ ہوتی ہے۔ پھر کوئی زود ہضم ٹھوس غذا۔ جوانی میں غذا اور انداز کی ہوتی ہے۔ بڑھاپے میں اور انداز کی۔ صحت کی حالت میں اس کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے بیماری کی حالت میں کچھ اور۔ ان تمام حالات میں آپ نے دیکھا کہ وہ اصول (کہ زندگی کا دارومدار

غذا پر ہے) شروع سے آخر تک غیر متغیر رہتا ہے۔ لیکن اس اصول کے کارفرما ہونے کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ اسے کہا جاتا ہے ثبات اور تغیر کا امتزاج۔ نہ یہ اصول تغیر پذیر ہوسکتا ہے اور نہ اس پر عمل ہونے کے طور طریق غیر متغیر۔ اگر غذا کی نوعیت اور اس کے طور طریق بھی غیر متغیر قرار دے دیئے جائیں تو زندگی چار قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔

جو اصول انسان کی طبیعی زندگی کو محیط ہے' اسی کے مطابق اس کی انسانی اور عمرانی زندگی بھی روبہ عمل رہتی ہے اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ کچھ اصول ہوں غیر متغیر اور ان اصولوں کی کارفرمائی کے لئے طور طریق ہوں جو حالات کے ساتھ بدلتے رہیں۔ خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے جو راہنمائی ملتی رہی اس کا انداز بھی یہی تھا۔ اس کے اصول تو شروع سے آخر تک غیر متبدل رہے لیکن ان اصولوں کی کارفرمائی کے طور طریق تغیر حالات کے تحت بدلتے رہے۔ ان بدلتے ہوئے طور طریق کو' ان اصولوں کی جزئیات کہا جاتا ہے۔ آپ قرآن کریم میں دیکھئے۔ ہر رسول کا پہلا پیغام یا اعلان یہ ہوتا تھا کہ:

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۱۱/۵۰)۔

''اے میری قوم! صرف اللہ کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرو۔ اس کے سوا کوئی ہستی نہیں جو ذی اقتدار ہو''۔

یہ دین کا اصل الاصول اور بنیادِ محکم تھی۔ یہی وہ دین کی اصل تھی جو شروع سے آخر تک ایک ہی رہی اور غیر متبدل رہی۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (۴۲/۱۳)۔

ہم نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوح کو دیا گیا تھا اور جو اب (اے رسول ﷺ!) تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا (اور ان سے کہا تھا کہ) اس دین کو محکم اور استوار رکھو اور اس میں تفرقہ مت پیدا ہونے دو۔

یہ تھا دین کا ناقابلِ تغیر و تبدل اصول۔ جہاں تک اس اصول کو بروئے کار لانے کا تعلق ہے (یعنی دین کی جزئیات)۔ سو شروع شروع میں چونکہ انسانی علم بڑا محدود تھا اس لئے وہ بھی بالعموم خدا ہی کی طرف سے عطا ہوتی تھیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ کے زمانے میں انسانوں کو (یا کم از کم اس خطۂ زمین کے لوگوں کو) کشتی بنانے کا ہنر بھی نہیں آتا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو یہ طریق بھی وحی کے ذریعے بتایا گیا۔ جب ان سے کہا گیا کہ:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا (۱۱/۳۷)۔

''تو ہماری زیر نگرانی اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا''۔

جوں جوں انسانی علم بڑھتا گیا' وحی کے ذریعے جزئیات متعین کرنے کی ضرورت کم ہوتی گئی۔ چنانچہ ہر نئے رسول کے زمانے میں' یہ دیکھا جاتا رہا کہ سابقہ جزئیات میں سے کون کون سی ایسی ہیں جن کی ضرورت باقی نہیں رہی یا جن میں تغیر وتبدل ضروری ہو گیا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے سورۂ بقرہ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (۲/۱۰۶)۔یعنی وحی کا انداز یہ رہا ہے کہ کسی سابقہ رسول کی وحی کے ایسے احکام جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا اور یہ نئے احکام پہلے احکام سے بہتر ہوتے۔جن سابقہ احکام کا علیٰ حالہٖ رکھا جانا مقصود ہوتا۔۔۔خواہ وہ اس رسول کی امت کے پاس ہوں یا اس نے انہیں فراموش کر دیا ہو۔ ان کی جگہ انہی جیسے احکام جدید وحی میں دے دیئے جاتے۔یعنی اصولی احکام غیر متبدل رہتے اور ان کی جزئیات میں بہ تقاضائے حالات تغیر وتبدل ہوتا رہتا۔

خدا کی آخری وحی

خدا کی طرف سے ملنے والی راہنمائی کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔تا آنکہ وہ زمانہ آ گیا جب مشیتِ خداوندی نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ وحی کی رو سے دیا جانا مقصود ہے اسے آخری مرتبہ دے دیا جائے اور اس کے بعد سلسلۂ وحی کو ختم کر دیا جائے۔ یہ وحی' جو قیامت تک تمام نوعِ انسان کی راہنمائی کے لئے کافی سمجھی گئی قرآن کریم کے اندر محفوظ کر دی گئی۔ چونکہ زمانہ وہ آ چکا تھا جب علم انسان بڑی تیزی سے ترقی کرتا چلا جاتا تھا اور خدا کے علم میں تھا کہ یہ اسی سرعت کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس لئے اس آخری وحی میں غیر متبدل اصول تو تمام کے تمام دے دیئے گئے لیکن ان کی جزئیات بہت کم دی گئیں۔ یہ اس لئے کہ اگر جزئیات بھی تمام کی تمام وحی کے ذریعے دے دی جاتیں تو وہ بھی قیامت تک تمام اقوامِ عالم کے لئے غیر متبدل قرار پا جاتیں۔لیکن جب وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتیں تو دین پر عمل پیرا ہونا مشکل (بلکہ بعض حالات میں) ناممکن ہو جاتا۔ان جزئیات میں تغیر اس لئے نہ ہو سکتا کہ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔لہٰذا' دین کے ہمیشہ کے لئے ممکن العمل رہنے کا طریقہ یہی تھا کہ ان اصولوں کی وہی جزئیات بذریعہ وحی دی جاتیں جن میں تغیر کی ضرورت نہ پڑتی۔ قابل تغیر جزئیات وحی کے ذریعے دی ہی نہ جاتیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہنمائی کو اس طرح قرآن کریم میں محفوظ کر دیا۔اور اس کے بعد اعلان کر دیا کہ:وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقاً وَعَدْلاً لَّا مُبَدِّلِ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۲/۱۱۵)۔خدا کی بات (دینِ خداوندی) صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئی۔اب ان احکامات میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ اس خدا کی طرف سے دیئے گئے ہیں جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ جو کچھ قرآن میں نہیں دیا گیا تھا اس کے متعلق تاکید سے کہہ دیا کہ تم ان کی بابت خواہ مخواہ کرید اور کاوش نہ کرو کہ وہ کیوں نہیں بتایا گیا۔ خدا کا پروگرام یہی تھا کہ انہیں وحی کے ذریعے متعین نہ کر دیا

جائے۔ اگر ایسا کر دیا جاتا تو کل کو جب ان میں تغیر کی ضرورت پڑتی تو تم مشکل میں پھنس جاتے کہ ان پر عمل کرنا ناممکن ہو جاتا اور ان میں تم تبدیلی کر نہ سکتے کیونکہ خدا کے متعین کردہ احکام میں تبدیلی تو صرف خدا کی وحی ہی کر سکتی تھی اور وحی کا سلسلہ اب بند ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ جو کچھ قرآن میں دیا گیا ہے، وہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ جو اس میں نہیں دیا گیا وہ غیر متبدل نہیں۔ (دیکھئے۔ سورۃ مائدہ۔ آیات ۱۰۲۔۱۰۱)۔

جزئیات کا تعین کیسے ہو؟

یہاں سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جب تمام کی تمام جزئیات قرآن کے اندر نہیں دی گئیں تو باقی ماندہ (قابلِ تغیر) جزئیات کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا اور کون ایسا کرنے کا مجاز ہو گا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات کی ضرورت کسی ایک زمانے میں بھی لاحق ہو گی اور پھر زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت بھی لاحق ہوتی رہے گی۔ اس کے لئے کیا کیا جائے؟ اس کا جواب خود خدا نے دے دیا (اور اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا)۔ اس نے کہا کہ دین خداوندی (اسلام) ایک نظام کی شکل میں کارفرما ہو گا۔ اسے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں مملکت یا نظامِ حکومت کہا جائے گا۔ اس نظام کا انداز مشاورتی ہو گا اور ان جزئیات کا تعین یا ان میں تغیر و تبدل اس نظام کی طرف سے ہو گا۔ اس نظام کے اولین سربراہ خود نبی اکرم ﷺ تھے۔ چنانچہ حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ۔۔۔ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۸)۔ یہ امور باہمی مشورہ سے طے کیا کرو۔ چنانچہ عہد رسالتمآب ﷺ میں ان جزئیات کا تعین اسی طریق سے ہوتا رہا۔۔ واضح رہے کہ مقصود بالذات تو دین کے اصولوں پر عمل پیرا رہنا یا انہیں نافذ کرنا تھا۔ یہ جزئیات ان اصولوں کی تنفیذ کا ذریعہ تھیں اس لئے یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ یہ جزئیات ان اصولوں سے کسی طرح بھی ٹکرائیں۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ جزئیات قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے باہمی مشاورت سے طے پاتی تھیں۔

یہ کچھ تو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہوتا رہا۔ اس کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ حضور ﷺ کی دنیا سے تشریف براری کے بعد کیا طریق اختیار کرنا مقصود تھا۔ اس کے لئے بھی قرآن کریم میں واضح راہنمائی دے دی گئی جب کہا گیا کہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ (۳/۱۴۴)۔

محمدؐ بجز ایں نیست کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گذرے ہیں۔ سو، اگر یہ (کل کو) وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام تو حضور ﷺ کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہ نہیں رہے تو نظام بھی ختم ہو گیا)، پھر اپنے قدیم

مسلک کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ جو ایسا کرے گا وہ خدا کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا (خود اپنا ہی نقصان کرے گا) لیکن جو اس نظام کی قدر دانی کرے گا تو اللہ اسے اس کا بدلہ دے گا۔

یعنی یہ بتا دیا گیا کہ دین کا یہ نظام رسول اللہ ﷺ کی ذات تک محدود نہیں۔ یہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد بھی اسی طرح جاری رہے گا اور ان جزئیات کے تعین یا ان میں عندالضرورت تغیر و تبدل کے لئے طریق کار بھی وہی اختیار کیا جائے گا جس کا حکم خود رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا۔ یعنی۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ یہ بھی ان امور کو باہمی مشاورت سے طے کریں گے''۔ چنانچہ حضور ﷺ کے بعد بھی یہ سلسلہ بدستور قائم رہا۔ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت یا خلافتِ راشدہ کا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں دین کی نئی جزئیات کا بھی تعین ہوا۔ اور جن سابقہ جزئیات میں کسی قسم کی تبدیلی محسوس ہوئی ان میں تغیر و تبدل بھی کیا گیا۔۔ اگرچہ اس کی ضرورت بہت کم مواقع پر پیش آئی۔ کیونکہ وہ زمانہ کچھ ایسا لمبا نہیں تھا۔ چند سالوں پر مشتمل تھا۔

☆☆☆

خلافتِ راشدہ کے بعد

کچھ عرصہ کے بعد یہ نظام ٹوٹ گیا' اور قرآن کریم نے جو پہلے وارننگ دی تھی کہ ''کیا تم پھر اپنے سابقہ مسلک کی طرف پلٹ جاؤ گے''۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی اور اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ یعنی انسانی معاملات دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ وہ جن کا تعلق امور دنیا سے سمجھا گیا اور دوسرا وہ جسے مذہبی امور کہہ کر پکارا گیا۔ یہی وہ ''قدیم مسلک'' تھا جس کے متعلق وارننگ دی گئی تھی کہ تم کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔ اب امور مملکت (یعنی دنیاوی امور) سلاطین نے سنبھال لئے اور مذہبی امور مذہبی پیشواؤں کی تحویل میں آ گئے۔ سلاطین کے لئے تو آسان تھا کہ وہ جس طرح بھی چاہتے اپنے احکام نافذ کرتے۔ مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ مسئلہ دِقت طلب ہو گیا کہ مذہبی امور کے فیصلوں کے سلسلہ میں کیا طریقِ عمل اختیار کیا جائے۔ مشاورت کا تو مذہب میں تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن میں جہاں شوریٰ کا حکم دیا گیا تھا اس کی تاویل یوں کر لی گئی کہ اس کا تعلق امور دنیا سے ہے' مذہبی امور سے نہیں۔ مذہبی امور کے لئے ''شریعت'' کی اصطلاح اختیار کی گئی اور کہا یہ گیا کہ اعتقادات اور نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' نکاح' طلاق وغیرہ سے متعلق مسائل دائرہ شریعت میں آتے ہیں۔ دین کے نظام میں' ہر دنیاوی کام جو احکامِ خداوندی کے مطابق سرانجام دیا جاتا' عبادت (یعنی خدا کی محکومیت) قرار پاتا تھا۔ اب عبادت کا مفہوم پرستش قرار پا گیا اور اس کا دنیاوی امور سے کوئی تعلق نہ رہا۔

روایات کے مجموعے

ہم نے ابھی ابھی کہا ہے کہ مذہبی پیشوائیت کے لئے یہ سوال غور طلب تھا کہ جو امور ان کے دائرہ اقتدار میں دے دیئے گئے ہیں ان کے متعلق فیصلے کس طرح کئے جائیں۔ ظاہر

ہے کہ ان امور کی جزئیات نہ تمام کی تمام قرآن مجید کے اندر موجود تھیں اور نہ ہی دین کا نظام باقی تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ جس دور میں دین کا نظام قائم تھا (یعنی عہدِ رسالتمآب ﷺ اور خلافتِ راشدہ) اس میں نافذ العمل جزئیات کا کوئی مستند مجموعہ تحریری طور پر امت کے پاس موجود نہیں تھا۔ بنابریں' اس کے سوا کوئی شکل نہیں تھی کہ جو کچھ لوگوں کی زبانی معلوم ہو' اسے جمع' مدون اور مرتب کر دیا جائے۔ یوں روایات کے مجموعے مرتب کئے گئے اور جو جزئیات ان میں ملیں انہیں احکامِ شریعت قرار دے کر..... .....امت کے لئے واجب العمل ٹھہرا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو روایات اس طریق سے جمع ہوئی تھیں ان میں بہت سے اختلافات اور تضادات تھے۔ ان اختلافات کی بنا پر امت میں تفرقہ پیدا ہو گیا اور مختلف فرقے وجود میں آ گئے۔ بالخصوص اس لئے کہ بے شمار روایات (احادیث) خود وضع کر کے انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا تھا۔

فِقہ

اس حد تک تو ان روایات نے کام دے دیا۔ لیکن زمانے کے تقاضے تو کسی مقام پر رُک نہیں سکتے۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور ان کے لئے نئی جزئیات کی ضرورت پڑتی گئی۔ اس سے یہ سوال سامنے آیا کہ اب کیا کیا جائے؟ فقہا نے اس کا حل یہ سوچا کہ جو کچھ شریعت کے نام سے موجود تھا اس پر غور و فکر کے بعد ایسے احکام مستنبط کئے جائیں جو زمانے کے ان بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ استنباطِ مسائل کے اس طریق کو اجتہاد کہا جاتا ہے اور جو احکام اس طرح مستنبط ہوں وہ فقہ کہلاتی ہے۔ چونکہ فقہ بھی ذاتی طور پر مستنبط اور مرتب ہوئی تھی (یعنی نظام کی طرف سے نہیں بلکہ مختلف ائمہ فقہ نے اسے ذاتی طور پر مرتب کیا تھا)۔ اس لئے اس میں بھی اختلاف فطری امر تھا۔ یوں امت میں مزید فرقے پیدا ہو گئے۔ کچھ وقت کے بعد یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اجتہاد کی رو سے بھی جس قدر فیصلے کئے جانے مقصود تھے وہ سب کئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا اب مزید اجتہاد کا دروازہ بھی بند ہے۔ امت پر یہ جمود صدیوں سے طاری ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دین کے نظام کے باقی نہ رہنے سے اسلام کیا سے کیا ہو گیا؟ وحی کا دروازہ خدا نے بند کیا تھا۔ روایات (احادیث) جمع اور مرتب ہو گئیں تو یہ سلسلہ بھی آخری حد تک پہنچ گیا۔ کچھ آگے بڑھنے کے لئے اجتہاد کا طریق اختیار کیا گیا تو کچھ عرصہ کے بعد اس کا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ یہ امت فرقوں میں بٹ گئی' اور قرآن کے الفاظ میں کیفیت یہ ہو گئی کہ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰/۳۲)۔ ہر فرقہ مگن ہو کر بیٹھ گیا کہ سچے اسلام پر وہی کاربند ہے۔ باقی سب باطل پر ہیں''۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ''سچا اسلام'' کہیں بھی باقی نہیں رہا تھا۔ سچے اسلام کے معنی تھے ایک امت۔۔ اس کا ایک نظام۔۔ نظام کی ایک مرکزی اتھارٹی جو باہمی مشاورت سے احکامِ خداوندی کو نافذ کرتی۔ جو ان جزئیات کا تعین کرتی جو قرآن میں نہیں تھیں۔ ان میں عند الضرورت اضافہ بھی کرتی اور تغیر و تبدل بھی۔ اس نظام کے نہ رہنے سے

امت کا شیرازہ بکھر گیا۔اسی تشتت وانتشار کی طغیانیوں اور فقدانِ مرکزیت کی تباہ کن حیرانیوں میں صدیوں سے امت گرفتار چلی آ رہی ہے۔اس سے بعض (دین کی حقیقت سے ناآشنا ذہن) اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ وحی کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہئے تھا۔چنانچہ اسی بنا پر بعض لوگ خود مدعیٔ نبوت بن بیٹھے۔

اسی پریشانیٔ فکر ونظر کا پیدا کردہ وہ فرقہ ہے جو ہمارے زمانے میں پنجاب میں نمودار ہوا اور اہلِ قرآن کے نام سے متعارف ہے۔اسے اتفاق کہئے یا اہل پنجاب کی بدبختی' کہ اہل قرآن اور ''احمدی'' دونوں خطۂ پنجاب سے نمودار ہوئے اور کم وبیش ایک ہی وقت میں۔یہ دونوں دین کے بہ حیثیت نظام کے تصور سے ناآشنا اور اسے ایک ''مذہب'' سمجھتے تھے (اور سمجھتے ہیں)۔

☆☆☆

فرقہ اہل قرآن

فرقہ اہل قرآن کے بانی (مولانا) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) تھے۔مرزا غلام احمد کے متعلق تو معلوم ہے کہ ان کی دعوت حکومتِ برطانیہ کی مقاصد براری کا ذریعہ تھی اور اس لئے اسی کے ہاتھوں کا لگایا ہوا پودا۔لیکن (مولانا) چکڑالوی کے متعلق اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نیت نیک تھی اور دل میں اسلام کا درد۔انہوں نے دیکھا کہ فرقہ بندی نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے۔فرقہ بندی کے متعلق انہیں معلوم تھا کہ اس کی بنیاد بالواسطہ یا بلاواسطہ روایات پر ہے۔اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو قرآن پر جمع کیا جائے۔یہاں تک تو بات صحیح بھی تھی اور صاف بھی۔لیکن اس سے آگے بڑھے تو انہیں الجھاؤ پیدا ہو گیا۔انہوں نے کہا کہ اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے خارج از قرآن کسی چیز کی ضرورت نہیں۔اس طرح انہوں نے احادیث (اور ان پر متفرع فقہ) کو بالکلیہ مسترد کر دیا۔اس پر مولوی صاحبان کی طرف سے سب سے پہلے وہ اعتراض وارد کیا گیا جسے وہ' اسلام کے دین سے مذہب میں تبدیل ہو جانے کے زمانے سے' وارد کرتے چلے آ رہے ہیں۔انہوں نے ان سے کہا کہ اگر اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے قرآن کافی ہے تو یہ بتائیے کہ ہم نماز کیسے پڑھیں؟ اسلام بہ حیثیت ایک نظام' کا تصور (مولانا) چکڑالوی کے سامنے تھا نہیں۔جس طرح معترضین اسے ایک مذہب سمجھتے تھے اسی طرح یہ بھی اسے ایک مذہب ہی خیال کرتے تھے۔لہٰذا انہیں ضرورت لاحق ہوئی کہ وہ قرآن سے نماز کی جملہ جزئیات نکالیں۔اس لئے کہ ان کا دعویٰ تھا کہ:

> اللہ تبارک وتعالیٰ نے نماز کی حقیقت' ماہیت' کیفیت' کمیت' طریقت وغیرہ یعنی جملہ افعال واقوال' حرکات و سکنات وغیرہ وغیرہ تمام امورات متعلقہ نماز بہ تفصیل و توضیح وتشریح قرآن مجید ہی میں بیان فرما دیئے ہیں۔
> (ترجمۃ القرآن' پارہ دوم' صفحہ ۲۰۷)۔

چکڑالوی صاحب نے قرآن کریم میں نماز کی جملہ حرکات و سکنات وافعال واذکار کی تلاش شروع کر دی۔وہ صرف ونحو کے عالم نظر آتے ہیں اور قرآنی آیات پر بھی انہیں عبور دکھائی دیتا

ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ قرآن کے سمندر میں ان موتیوں کی تلاش میں غوطہ زن ہوئے جو وہاں موجود نہیں تھے۔ اس میں شناوری، غیر موجود کو موجود کیسے بنا سکتی تھی۔ لہٰذا، وہ لگے ٹامک ٹوئیاں مارنے۔ فی طغیانھم یعمھون۔ اس سعیٔ ناکام میں انہیں جس کھینچا تانی سے کام لینا، اور اس کی وجہ سے جس اضطراب و ہیجان حتیٰ کہ چڑچڑاہٹ اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہونا پڑا، وہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ بات چونکہ مناظرانہ دعویٰ کی تھی، اس لئے اعترافِ شکست بھی ممکن نہیں تھا۔ اس طرح یہ ''جان مجنوں، دوگونہ عذاب میں مبتلا'' ہوگئی۔ انہوں نے بزعم خویش، جو کچھ قرآن سے ثابت کیا، وہ پانچ وقتوں کی نماز، نماز کی دو، تین اور چار رکعتیں اور ہر رکعت میں دو سجدے تھے۔ یعنی مروجہ نماز ہی کے ارکان۔ لیکن ان کے ثابت کرنے کا انداز اس قدر رکیک تھا کہ اس پر عقل شرمائے اور علم ماتم کرے۔ مثلاً وہ رکعتوں کی تعداد کے سلسلہ میں ''بہ تحقیق انیق'' پیش فرماتے ہیں کہ:

الْحَمْدُ لِلَّهِ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَاعِلِ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا أُولِي أَجْنِحَةٍ مَّثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ (۳۵/۱)۔

اس کا سیدھا سادھا ترجمہ یہ ہے۔

''سب خوبی اللہ تعالیٰ کو ہے جس نے بنا نکالے آسمان اور زمین، جس نے ٹھہرایا فرشتوں کو پیغام لانے والے۔ جن کے پَر ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار''۔
(ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

(مولانا) چکڑالوی اس کا حسب ذیل ترجمہ لکھتے ہیں:

پڑھا کرو اے ہر ایک اہل آسمان و اہل زمین۔ الحمد (یعنی پانچوں نمازیں) واسطے راضی کرنے اللہ تعالیٰ کے، کیونکہ وہ فطرت پاک کرنے والا ہے۔ تم تمام آسمان والوں (فرشتوں کی) اور تم تمام روئے زمین والوں (جن وانس کی)۔ چونکہ تم فطرت اللہ میں تغیر و تبدیل کرتے رہتے ہو اس لئے نمازیں پڑھا کرو تا کہ جبر و نقصان ہوتا رہے؟ اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو کرنے والا ہے اپنے فرشتوں کو رسول تمہاری طرف۔ جو لانے والے تمہاری صلواتوں۔ یعنی چھ ارکانوں کے ہیں۔ جن کا حق یہ ہے کہ کسی وقت میں دو دو بار ادا کی جائیں اور کسی وقت میں تین تین اور کسی وقت میں چار چار دفعہ مطابق تعلیم کتاب اللہ۔ (یعنی جس وقت کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دو بار ادا کرنے کا حکم فرمایا، تم بھی اس وقت ان چھ ارکان کو دو ہی بار پڑھا کرو اور جس وقت ان کو تین بار ادا کرنے کا حکم دیا ہے، تم بھی اس وقت میں ان کو تین ہی بار ادا کیا کرو اور جس وقت میں فاطر السمٰوٰت والارض نے تم کو چار باران کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس وقت چار بار پڑھا کرو۔
(ترجمۃ القرآن، پارہ پانچ، صفحہ ۷۶)۔

اور اس کے بعد پانچ چھ صفحات میں قرآن کریم کی مختلف آیات اور ان کی (اپنی) تشریح کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

(یہ کچھ) اس بات کا قطعی اور یقینی فیصلہ کرتا ہے کہ نماز کی رکعتیں اس طرح ہیں کہ فجر کی دو، شام کی تین، ظہر و عصر و عشاء میں سے ہر ایک کی چار۔ (ایضاً، ص ۸۳)۔

آپ غور کیجئے کہ یہ قرآن کے ساتھ (معاذ اللہ) کھلا ہوا مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

یا (مثلاً) انہوں نے قرآن سے (باندازِ بالا) یہ ثابت کیا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں۔ اس طرح کہ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف گئے تو چونکہ معرکہ بڑا صبر آزما تھا، اس لئے ان سے کہا گیا کہ وہاں کسی سے ڈرنا نہیں۔ مضطرب و بیقرار نہیں ہونا۔ پوری دلجمعی اور اطمینان سے اپنی بات پیش کرنا۔ اس کے لئے الفاظ یہ استعمال کئے گئے کہ: وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸/۳۲)۔ ''یعنی خوف کی حالت میں پھڑ پھڑانا نہیں بلکہ اپنے بازو سمیٹ لینا''۔ (مولانا) چکڑالوی فرماتے ہیں کہ:

> اس سے ثابت ہوا کہ حکمِ خداوندی یہ ہے کہ نماز میں اپنے ہاتھ کہنیوں تک ایک دوسرے کے اوپر جمع کر کے اپنے سینے کے ساتھ ملاؤ۔ (ترجمۃ القرآن، پارہ ۲، ص ۲۰۶)۔

غرضیکہ وہ اسی طرح نماز کی جملہ جزئیات قرآن کریم سے ''ثابت'' کرتے چلے جاتے ہیں اور جو کچھ اس طرح ''ثابت'' کرتے ہیں اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ''یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس کی خلاف ورزی کتاب اللہ کی سراسر مخالفت ہے''۔ (ایضاً۔ پارہ ۳، ص ۶۳۔۶۱)۔ ان الفاظ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ان سے ایک اہم نتیجہ سامنے آئے گا۔

حرکات و سکنات کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ نماز میں پڑھنا کیا چاہئے۔ اس میں سوائے سورۂ فاتحہ کے، سب کچھ مروجہ نماز سے مختلف ہے، اگرچہ وہ ہیں قرآن ہی کی آیات۔

ایک اہلحدیث کا ''لقمہ''

یہ ہے وہ طریق جس سے چکڑالوی صاحب نے نماز اور اسی طرح قرآن کریم کے دیگر اصولی احکام کی جزئیات قرآن سے ''ثابت'' کیں۔ جب قرآن سے اثبات و تعیینِ احکام کا انداز یہ ٹھہرا تو پھر اس میں کوئی روک کس طرح پیدا ہو سکتی تھی؟ چنانچہ خود (مولانا) چکڑالوی کی (غالباً) زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد انہی کے ہم خیال ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنا شروع کر دیں۔ مثلاً چکوال کے مولوی محمد فاضل اور مولوی محمد عالم۔ گوجرانوالہ کے مولوی محمد رمضان، اکال گڑھ کے مولوی چراغدین وغیرہ۔ ان میں سے کسی نے ایک وقت کی نماز اور ہر نماز کی ایک رکعت بتائی۔ کسی نے تین دن کے روزے اور کسی نے نو دن کے۔ کسی نے فلاں چیز کو حلال قرار دیا اور کسی نے فلاں کو حرام۔ غرضیکہ ان کی ان کوششوں سے خدا کی اس کتاب عظیم کی (معاذ اللہ) اس طرح دھجیاں فضا میں بکھیریں کہ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی کی بات پر بھی لوگوں نے دھیان نہ دیا۔ ورنہ جتنے

فرقے، بہ ہیئت مجموعی مسلمانوں میں اس وقت موجود ہیں ان سے کہیں زیادہ اس ایک نظریہ سے پیدا ہو جاتے۔ ان میں سے صرف ایک گروہ (جو معدودے چند نفوس پر مشتمل ہے) اس وقت تک موجود ہے جس کا تعارف ان کے ترجمان، ماہنامہ بلاغ القرآن کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سمن آباد (لاہور) میں ان کی ایک ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد ہے جس میں وہ (بزعمِ خویش) تین وقت کی ''قرآنی نمازیں'' پڑھتے ہیں۔ ان تین نمازوں کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ (مولانا) چکڑالوای نے قرآن کریم سے پانچ وقت کی نمازیں ثابت کی تھیں۔ وزیرآباد (ثم گجرات) کے ایک اہلحدیث عالم حافظ عنایت اللہ صاحب نے ان کی تردید کی اور کہا کہ قرآن مجید سے تو صرف تین وقتوں کی نمازیں ثابت ہوتی ہیں۔ آپ پانچ وقتوں کی کس طرح ثابت کرتے ہیں۔ یہ (مولانا) چکڑالوی کی زندگی کے آخری ایام کی بات ہے۔ انہوں نے تو اپنے خیال سے رجوع نہ کیا لیکن ان کے بعد ان کے متبعین کے لاہور کے گروہ نے حافظ عنایت اللہ صاحب کی بات اچک لی اور کہا کہ قرآن کی رو سے نمازیں تین ہی ہیں۔ ادارہ بلاغ القرآن کی طرف سے ''الصلوٰۃ'' کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے (چکڑالوی صاحب کے طریق کے مطابق) ثابت کیا ہے کہ قرآنِ مجید کی رو سے:

(۱) نمازوں کی تعداد تین ہے۔ (چکڑالوی صاحب نے پانچ نمازیں بتائی تھیں)۔

(۲) ہر نماز کی صرف دو رکعتیں ہیں۔ (چکڑالوی صاحب نے دو، تین، چار رکعتیں کہی تھیں)۔

(۳) ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ ہے۔ (چکڑالوی صاحب نے ہر رکعت میں دو سجدے بتائے تھے)۔

(۴) نماز کے لئے اذان کی ضرورت نہیں۔

(۵) اللہ اکبر کہنا خلافِ قرآن ہے۔

(۶) السلام علیکم کے بجائے سلام علیکم کہنا چاہئے۔

نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے کے یہ بھی قائل ہیں لیکن اس کا اثبات سورۃ الکوثر کی اس آیت سے کرتے ہیں۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (۱۰۸/۲)۔ جس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ ''پس اپنے رب کے حضور میں نماز ادا کیا کر اور سینے پر ہاتھ باندھ کر قبلہ رو کھڑا ہوا کر''۔ (پمفلٹ مذکور ص ۱۸)۔ مولانا چکڑالوی کی طرح ان کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ قرآن کریم کا قطعی فیصلہ ہے (ایضاً ص ۲۲)۔ اس کے خلاف کچھ ''ثابت کرنا'' صریحاً ''خلافِ قرآن'' ہے۔ (ایضاً، ص ۲۹)۔ خدا نے اپنی تنزیلی کتاب میں یہی حکم دیا ہے۔ (بلاغ القرآن، بابت دسمبر ۱۹۷۴ء، ص ۳۲)۔ جہاں تک اذکارِ صلوٰۃ کا تعلق ہے، دعائے قبل الصلوٰۃ سے لے کر سلام تک ان کی نماز بھی (بجز سورۂ فاتحہ) باقی مسلمانوں کی نماز سے بالکل الگ ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ رکوع میں یہ دعا پڑھنی چاہئے۔

رب اوزعنی ان اشکر نعمتک اللتی انعمت علی و علیٰ والدی وان اعمل

صالحاً ترضٰہ و اصلح لی فی ذریتی۔ انی تبت الیک و انی من المسلمین ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر۔ ربنا لا تجعلنا فتنة للذین کفروا۔ واغفرلنا۔ انک انت العزیز الحکیم۔

اور سجدہ میں یہ دعا:

سبحن ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا۔ الحمدلله الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن لہٗ شریک فی الملک ولم یکن لہٗ ولی من الذل ربنا صرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراما۔ انھا ساء ت مستقراً و مقاماً۔ ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریٰتنا قرة اعین وجعلنا للمتقین اماماً۔ (پمفلٹ مذکور، ص ۵۱)۔

☆☆☆

قرآن کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے

میں کہتا چلا آ رہا ہوں، اور اسے اب پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے قرآن کو سب سے زیادہ نقصان اس فرقہ نے پہنچایا ہے۔ سطح بین نگاہوں میں میری یہ بات بڑی تعجب انگیز سی دکھائی دے گی کیونکہ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ جو لوگ دین کے معاملہ میں قرآن کو کافی تسلیم کرتے ہیں اور ہر بات کو قرآن ہی سے ثابت کرتے ہیں وہ قرآن کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے کس طرح ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ نکتہ ٹھنڈے دل اور گہرے غور اور تدبر سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّهِ لَوَجَدُواْ فِيهِ اخْتِلاَفاً كَثِيراً (۴/۸۲)۔

کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت سے اختلافات پاتے۔

یہ آیۂ جلیلہ بڑی اہم اور بنیادی ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ہی نہیں بلکہ ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اگر (معاذ اللہ) یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن ایسے احکام دیتا ہے جن میں باہمد گر اختلاف اور تضاد ہے تو اس سے قرآن مجید کے من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے اور دین کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ گرتی ہے۔

مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں اور ان میں باہمی اختلافات بھی، لیکن ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ ان کے ان اختلافات کی بنیاد قرآن ہے۔ اہل حدیث کے اختلافات کی بنیاد روایات پر ہے۔ حدیث کے متعلق اگرچہ ان کے ہاں یہ عقیدہ بھی موجود ہے کہ اس کی بنیاد وحی خفی پر ہے لیکن اس کے باوجود وہ **قال الرسول** کو **قال اللہ** سے الگ رکھتے

ہیں۔اس لئے ان کے اختلافات کی زد براہ راست قرآن کریم پر نہیں پڑتی۔

اہلِ حدیث سے آگے بڑھئے تو اہل فقہ سامنے آتے ہیں۔ان کے اختلافات کی بنیاد ان کے ائمہ کا اجتہاد ہے۔ان کا دعویٰ یہ ضرور ہے کہ ان کے ائمہ کے اجتہاد کی بنیاد قرآن اور احادیث ہی پر ہے لیکن وہ اسے قال اللہ نہیں کہتے۔اپنے ائمہ کے اقوال ہی کہتے ہیں۔لہٰذا فقہی اختلافات کی زد بھی قرآن پر نہیں پڑتی۔

لیکن فرقہ اہل قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ خدا کا ارشاد ہے۔وہ قرآن کا حکم ہے۔اب ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کو ماننے والوں میں سے جب ایک کہتا ہے کہ اس معاملہ کے متعلق قرآن کا حکم یہ ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ اس کا حکم یہ ہے جو پہلے حکم کے خلاف ہے تو اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ایک ہی معاملہ کے متعلق قرآن مختلف اور متضاد احکام دیتا ہے۔ اس سے قرآن کے منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ یکسر باطل قرار پا جاتا ہے۔دیگر احکام کو تو چھوڑیئے اس فرقہ کے بانی (مولانا) چکڑالوی اور ان کے متبعین (بلاغ القرآن والوں) نے صرف نماز کے متعلق جو قرآنی احکام بتائے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔مثلاً:

مولانا چکڑالوی کے مطابق قرآن نے کہا ہے

(۱) نمازیں پانچ وقت کی ہیں۔

(۲) نمازوں کی رکعتیں دو دو، تین تین، چار چار ہیں۔

(۳) ہر رکعت میں دو سجدے ہیں۔

بلاغ القرآن والوں کے مطابق قرآن نے کہا ہے

(۱) نمازیں تین وقت کی ہیں۔

(۲) ہر نماز کی صرف دو رکعتیں ہیں۔

(۳) ہر رکعت میں صرف ایک سجدہ ہے۔

آپ غور کیجئے کہ یہ نماز سے متعلق محسوس اور مرئی احکام ہیں جو ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں اور ان دونوں کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایسا کہا ہے۔جو اس کے خلاف کہتا ہے وہ قرآن کی مخالفت کرتا ہے۔**انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے اپنی بصیرت کے مطابق قرآن سے یہ احکام مستنبط کئے ہیں۔ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن نے یہ جزئیات خود متعین کی ہیں۔**اب آپ سوچئے کہ جب یہ چیز غیر مسلموں کے سامنے آئے کہ قرآن نے نماز کے تین وقت بھی بتائے ہیں اور پانچ بھی۔اس نے نماز کی دو رکعتیں بھی مقرر کی ہیں اور فجر کی نماز کی دو، ظہر، عصر اور عشاء کی چار اور مغرب کی تین رکعتیں بھی۔اسی قرآن نے ایک رکعت کے لئے ایک سجدہ مقرر کیا ہے اور اسی نے دو سجدے۔۔تو وہ قرآن کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ غیر مسلم تو ایک طرف، جب سمجھنے سوچنے والے مسلمان نوجوانوں کے سامنے بھی یہ بات آئے گی تو ان کا قرآنِ کریم کے متعلق کیا تصور ہوگا؟ اور یہ تو ابھی ہم نے صرف نماز کے متعلق بتایا ہے۔دیگر احکام کے متعلق بھی ان کی تصریحات سامنے آئیں تو قرآن کے متعلق تصور یہ پیدا ہوگا کہ یہ تو ہے ہی اختلافات کا مجموعہ۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ میں نے جو کہا ہے کہ قرآن کریم کو سب سے زیادہ نقصان اس فرقہ نے پہنچایا ہے۔ تو اس میں ذرا بھی مبالغہ ہے؟

اسے ایک دفعہ پھر ذہن نشین کر لیجئے کہ (مولانا) چکڑالوی اور بلاغ القرآن والے' دونوں کا دعویٰ یہ ہے کہ نماز کی جزئیات خود قرآن کی متعین کردہ ہیں۔ ان کی مستنبط کردہ نہیں اور صرف نماز کی جزئیات ہی نہیں قرآن کریم نے تمام احکام کی جزئیات خود متعین کر دی ہیں۔ اس کے لئے ان کی سند اور دلیل یہ ہے کہ قرآن نے اپنے آپ کو ''مفصل'' اور ''تفصیل کل شئ'' کہا ہے۔ یہ ٹھوکر تھی جو (مولانا) چکڑالوی کو لگی اور جس کے پیچھے ان کے متبعین آنکھیں بند کر کے چلے آ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے' کہ قرآن کریم کے ''مفصل کتاب'' ہونے کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

کتاب مفصل کا صحیح مفہوم

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو کہیں اَلْکِتَابَ مُفَصَّلاً (۶/۱۱۵) کہا ہے' کہیں تَفْصِیْلَ الْکِتَابِ (۱۰/۳۷) اور کہیں تَفْصِیْلَ کُلَّ شَیْءٍ (۱۲/۱۱۱) وغیرہ۔ اردو زبان میں تفصیل' تفاصیل' تفصیلات (جیسے الفاظ) جزئیات کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں' اور مفصّل اسے کہتے ہیں جس میں کسی بات کو مجملاً بیان نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ اس کی جزئیات بھی دی گئی ہوں۔ انگریزی میں انہیں (Details) کہا جاتا ہے۔ (مولانا) چکڑالوی کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ قرآن کریم میں بھی یہ الفاظ انہی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں جن معانی میں یہ اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ بنیادی اینٹ غلط رکھی گئی اس لئے ان کے دعاوی کی دیوار' تاثر یا ٹیڑھی اٹھتی چلی گئی۔ عربی زبان میں مادہ (ف۔ص۔ل) اور اس سے بننے والے الفاظ' ان معانی میں استعمال نہیں ہوتے۔ اس میں اس مادہ کے معنی ہیں ''الگ الگ کر دینا''۔ ''فصل الحدبین الارضین'' کے معنی وہ حدِ فاصل ہے جو زمین کے دو قطعات کو الگ الگ کر دے۔ فصالؔ بچے کے دودھ چھڑانے کو کہتے ہیں۔ یعنی بچے کو ماں سے الگ کر دینے کو۔ فصل الشاۃ کے معنی ہیں قصاب نے بکری کے گوشت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تفصیلؔ کے معنی ہیں کپڑے کے ٹکڑے الگ الگ کر دینا۔ فصول السنۃ۔ سال کے چار موسموں (فصلوں) کو کہتے ہیں۔ فاصلۃؔ اس منکے کو کہتے ہیں جو ہار میں پروئے ہوئے دو موتیوں کے درمیان پرویا جائے تاکہ اس سے وہ دو موتی الگ الگ متمیز ہو جائیں۔ ایسے ہار کو عقد مفصّل کہا جاتا ہے۔ الفاصلؔ جج کو کہتے ہیں اور فیصلہؔ اس کے اس حکم کو جو جائز اور ناجائز' حق اور باطل' غلط اور صحیح کو الگ الگ کر دے۔ فاصلہؔ دو مقامات کو الگ کر دیتا ہے۔ (یہ تمام معانی عربی زبان کی مستند کتب لغت میں موجود ہیں)۔

اس مادہ کے ان معانی کے لحاظ سے تفصیلؔ کے معنی ہیں' واضح کر دینا۔ کھول کر بیان کر دینا (امام راغب) اور مفصّل کے معنی' وہ کتاب جس میں ہر بات نہایت وضاحت سے' نکھار کر' الگ الگ کر کے' بیان کی جائے۔ جس کے بیان میں کوئی ابہام

نہ ہو۔ التباس نہ ہو۔ الجھن نہ ہو۔ ہر بات نہایت واضح، نکھری اور ابھری ہوئی ہو۔ انگریزی میں اسے کہیں گے (Distinctly Stated)۔ واضح رہے کہ قرآن کریم میں وضاحت یا واضح (یا اس مادہ سے اور الفاظ) نہیں آئے۔ اس میں، وضاحت یا واضح کے لئے تفصیل یا مفصل (وغیرہ) الفاظ آئے ہیں۔

ان تشریحات کے بعد قرآن کریم کی طرف آیئے۔ اس میں، اس مادہ (ف۔ص۔ل) کے الفاظ حسب ذیل معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔

(۱) وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ (۱۲/۹۴) جب قافلہ وہاں سے روانہ (جدا ہوا)۔

(۲) فِصَالُهُ فِيْ عَامَيْنِ (۳۱/۱۴)۔ بچے کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے۔

(۳) إِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۲۲/۱۷) و دیگر مقامات)۔ اللہ تعالیٰ ان میں، قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔

(۴) يَوْمُ الْفَصْلِ (۳۷/۲۱) و دیگر مقامات)۔ فیصلہ کا دن۔

(۵) قَوْلٌ فَصْلٌ (۸۶/۱۳)۔ فیصلہ کن بات۔

(۶) هُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ (۶/۵۷)۔ خدا بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۷) سورۂ انعام میں، کارگۂ کائنات کے مختلف عوامل و عناصر کی تگ و تاز کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُوْنَ (۶/۹۸، ۶/۹۹)۔ ہم نے اپنی آیات کی وضاحت، ان لوگوں کے لئے کر دی ہے جو علم و بصیرت سے کام لیں۔

(۸) اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر، کفر اور اسلام قبول کرنے کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کے بعد فرمایا۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُوْنَ (۶/۱۲۷) ہم نے ان آیات کو اس قوم کے لئے واضح کر دیا ہے جو (خدائی راہنمائی کو) اپنے سامنے رکھنا چاہے۔

(۹) سورۂ اعراف میں اہل جنت اور جہنم کے اصولی امتیازات کی وضاحت کے بعد کہا۔ وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَى عِلْمٍ .....(۷/۵۲)۔ ہم ان کی طرف وہ کتاب لائے ہیں جسے ہم نے از روئے علم واضح کیا ہے۔

(۱۰) سورہ اسرائیل میں، گردشِ لیل و نہار اور عدد السنین (سالوں کی گنتی) وغیرہ بیان کرنے کے بعد کہا۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيْلًا (۱۷/۱۲)۔ اور ہم نے ہر شے کی خوب خوب وضاحت کر دی ہے۔

(۱۱) اسی طرح دیگر مختلف مقامات پر، اپنی تعلیم کو واضح طور پر بیان کر دینے کے بعد فرمایا۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ (۶/۵۵، ۶/۳۲، ۷/۱۷۴، ۱۱/۹، ۲۴/۱۰، ۲۸/۳۰، ۵/۱۰، ۲/۱۳)۔ ان آیات میں احکام کی جزئیات کہیں بھی نہیں آئیں۔ ان کی وضاحت ہی کی گئی ہے۔

(۱۲) ان معانی کی روشنی میں سورۂ ہود کی پہلی آیت (۱۱/۱)۔ کو لیجئے جس میں کہا گیا ہے کہ: كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ

ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۔وہ کتاب جس کے احکام کو نہایت محکم بنایا گیا ہے اوران کی وضاحت خود خدا کی طرف سے کردی گئی ہے۔

(۱۳) سورۂ حٰم السجدۃ میں قُرْآناً عَرَبِيّاً (واضح اور فصیح قرآن) کے ساتھ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ (۴۱/۳) آیا ہے۔مطلب بالکل واضح ہے۔اسی سورۃ میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ:وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآناً أَعْجَمِيّاً لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ (۴۱/۴۴)۔ اگر ہم اسے عجمی زبان میں نازل کرتے تو یہ اعتراض کر دیتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں کی گئیں۔ یہاں فُصِّلَتْ کا مفہوم نکھر کر سامنے آ گیا ہے۔

(۱۴) سورۂ ص میں ہے کہ (حضرت) داؤدؑ کو حکمت عطا کی گئی اور فَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸/۲۰) معاملات کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔

(۱۵) سورۂ شوریٰ میں كَلِمَةُ الْفَصْلِ (۴۲/۲۱) آیا ہے۔ جس کے معنی ہیں فیصلہ کن بات۔

(۱۶) سورہ یونس میں قرآن کریم کے متعلق ہے۔تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ الْكِتَابِ (۱۰/۳۷)اس کے معنی صاف ہیں۔یعنی قوانینِ خداوندی کی وضاحت کرنے والی۔سورۂ یوسف میں ہے:تَفْصِيلَ كُلَّ شَيْءٍ (۱۲/۱۱۱)۔یعنی جتنی باتیں اس میں کہی گئی ہیں، سب واضح اور نکھری ہوئی ہیں۔ان میں کوئی ابہام نہیں۔سورۂ انعام میں یہی الفاظ کتاب موسیٰؑ کے متعلق آئے ہیں۔(۶/۱۵۵ نیز ۷/۱۴۵ میں)۔

(۱۷) سورۂ اعراف میں حضرت موسیٰؑ کو دی گئی نشانیوں کو آيَاتٍ مُّفَصَّلَاتٍ کہہ کر پکارا گیا ہے(۷/۱۳۳)یعنی وہ نشانیاں جو حق کو باطل سے الگ کر کے بتا دیں۔

(۱۸) ان آیات کے بعد آخر میں سورہ انعام کی اس آیت کو سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ أَفَغَيْرَ اللّهِ أَبْتَغِي حَكَماً وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلاً (۶/۱۱۵)۔کیا میں خدا کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کی تلاش کروں۔حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایسا ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے جو اپنے مطالب میں بالکل واضح ہے۔دوسری جگہ اس کی وضاحت تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) کہہ کر کردی۔یعنی یہ کتاب تبیین بھی ہے۔یعنی اپنے مطالب کو ابھار کر بیان کرنے والی۔اور مفصل بھی۔یعنی انہیں نکھار کر بیان کرنے والی (Clearly and Distinctly) بیان کرنے والی۔(مولانا محمود الحسنؒ نے۔۔شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی بنا پر (کتاب مفصل) کا ترجمہ ''کتاب واضح'' کیا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا ترجمہ ''کھول کھول کر باتیں بیان کرنے والی'' کیا ہے۔شاہ ولیؒ اللہ نے ''واضح کردہ شد'' کیا ہے۔اور طرفہ تماشہ یہ کہ خود مولانا عبداللہ چکڑالوی نے اس کا ترجمہ ''بالکل واضح اور روشن کتاب'' کیا ہے۔ہم اردو زبان میں انتہائی وضاحت کے لئے کہتے ہیں کہ ''وہ ایک ایک لفظ الگ الگ بولتا ہے''۔

ان تشریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ (مولانا) چکڑالوی کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ

انہوں نے قرآن کریم کے ''کتاب مفصل'' ہونے کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ اس میں دین کے تمام اصولی احکام کی جزئیات (اردو' تفاصیل) بھی دی ہوئی ہیں۔ اسی سے ان کی سوچ کی گاڑی غلط پٹڑی پر پڑ گئی اور جب مولویوں کے ساتھ ان کے مناظرے شروع ہو گئے تو' جیسا کہ مناظروں میں ہوتا ہے۔۔ پندار نفس' ضد اور تعصب' (بَغۡيًۢا بَيۡنَهُمۡ۔ ۲/۲۱۳) نے انہیں اس قابل ہی نہ رہنے دیا کہ وہ اپنے مسلک پر نظر ثانی کر سکیں۔۔ اور ان کی یہی لکیر ان کے متبعین پیٹے جا رہے ہیں۔ (ان میں تو کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی نظر نہیں آتا)۔ ان کا دعویٰ ان کی زبانی سنئے۔ کہتے ہیں۔

> طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قرآن میں صرف احکام ہیں اور باستثنائے چند' ان کی تفصیلات اس میں موجود نہیں۔ مگر بلاغ القرآن کا مسلک یہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں احکام مع تفصیلات موجود ہیں۔ (بلاغ القرآن۔ فروری ۷۵ء' ص ۴۵)۔

قرآن کا تبیینِ احکام کا انداز

اس کے بعد آیئے آپ ان کے اس دعویٰ کی طرف کہ قرآن مجید نے اپنے تمام احکام کی جزئیات خود متعین کر رکھی ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ پہلے یہ دیکھئے کہ احکامات کے سلسلہ میں قرآن کریم کا طریق اور انداز کیا ہے۔ اس نے اپنی آیات کو دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ متشابہات اور محکمٰت (۳/۶)۔ متشابہات وہ فطری اور مابعدالطبیعاتی بسیط حقائق ہیں جنہیں اس نے تشبیہاً بیان کیا ہے۔ ان کے متعلق ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ جہاں تک محکمٰت کا تعلق ہے' یہ قرآنی احکام و قوانین ہیں اور جس طرح احکام و قوانین کی صورت میں ہونا چاہئے' انہیں اس نے بالکل واضح اور محکم انداز میں بیان کر دیا ہے۔ اگر کسی ضابطۂ قوانین کے احکام واضح شکل میں نہ ہوں تو وہ ضابطہ قابلِ عمل نہیں ہوسکتا۔ ان احکام کی یہ شکل نہیں کہ زیدؔ ان سے کچھ سمجھے اور بکرؔ کچھ اور۔ دو چار مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

(۱) سورہ نساء کی دو تین آیات میں اس نے ان رشتوں کی تفصیل دی ہے (یعنی وضاحت کی ہے) جن سے نکاح حرام ہے۔ آپ ان رشتوں پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ انہیں کس قدر متعین انداز میں بیان کیا گیا ہے۔۔ اس قدر متعین انداز میں کہ حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ أُمَّهَاتُكُمۡ (تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں) کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ وَلَا تَنكِحُواْ مَا نَكَحَ آبَاؤُكُم مِّنَ النِّسَاء (۴/۲۲-۲۳)۔ ''جن عورتوں سے تمہارے باپوں نے نکاح کیا تھا' ان سے بھی نکاح نہ کرو''۔ یعنی أُمَّهَاتُكُمۡ (مائیں) سے چونکہ یہ بات واضح نہیں تھی کہ ان میں سوتیلی مائیں بھی شامل ہیں یا نہیں' اس نے اس کی بھی وضاحت کر دی۔ اس وضاحت کی موجودگی میں ہر شخص پورے حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ خدا نے سوتیلی اور حقیقی ماؤں (دونوں) سے نکاح حرام قرار دیا ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی کہہ دے کہ سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہے اور دوسرا کہہ دے کہ نہیں! قرآن کی رو سے اس سے نکاح جائز ہے۔ یہ ہے محکمٰت کا انداز۔

(۲) سورہ نساء ہی میں اس نے وراثت کے حصوں کا تعین کیا ہے۔ دیکھئے کہ اس نے کس طرح مختلف وارثوں کے چھوٹے بڑے تمام حصوں کی جزئیات تک کا تعین کر دیا ہے۔ فلاں کا نصف۔ فلاں کا تہائی۔ فلاں کا چھٹا حصہ۔ فلاں کا آٹھواں حصہ وغیرہ۔ یہ ہے قرآن کی رو سے جزئیات کا تعین۔ یعنی جن احکام کی اس نے جزئیات خود متعین کی ہیں' ان جزئیات کی کیفیت یہ ہے۔

(۳) سورۂ بقرہ (۲/۱۸۰) میں اس نے وصیت کا اصولی حکم دیا ہے۔ اس کے بعد' سورہ مائدہ میں اس نے اس طریق کی وضاحت کر دی جس کے مطابق وصیت کو ضبط میں لانا چاہئے۔ (۱۰۸۔۱۰۶/۵)۔ ان آیات میں آپ دیکھئے کہ اس نے اس طریق کی جزئیات کا کس وضاحت سے ذکر کر دیا ہے۔

(۴) سورۂ بقرہ میں اس نے لین دین کے معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا حکم دیا۔ (۸۳۔۲/۲۸۲)۔ ان آیات میں آپ دیکھئے کہ اس نے کس وضاحت سے بتایا ہے کہ اسے کس طرح لکھا جائے۔ کون لکھے۔ کون لکھوائے اس پر کس طرح گواہ مقرر کئے جائیں۔ ان کی شہادت کس طرح قلمبند کی جائے۔ اگر تم حالت سفر میں ہو تو کیا کرو..... یہ جزئیات اس قدر وضاحت سے اور متعین طور پر مذکور ہیں کہ آیت (۲/۲۸۲) قرآن مجید کی (غالباً) سب سے لمبی آیت ہے۔ یہ ہے تعیین و تبیین جزئیات کا قرآنی انداز۔

(۵) اس نے نکاح' طلاق' مہر' عدت وغیرہ سے متعلق احکام دیئے تو دیکھئے ان کی جزئیات کو کس متعین انداز سے بیان کر دیا۔

(۶) اس نے روزوں کے احکام دیئے تو دیکھئے انہیں کس طرح متعین انداز میں بیان کیا ہے۔۔۔ ایک مہینے کے روزے۔ صبح کی سیاہ اور سفید دھاری کے نمایاں ہونے سے لے کر رات تک' کھانے' پینے اور جنسی اختلاط کی ممانعت۔ مسافر اور بیمار کی صورت میں التوا۔ جس کے لئے روزہ ناقابلِ برداشت ہو اس کی استثناء۔ یہ تمام جزئیات متعین طور پر بیان کر دیں۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھا کہ جن احکام کی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین کر دی ہیں' ان میں انسانی قیاس آرائیوں کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ان میں کا ہر حکم واضح اور متعین ہے اور ہر شخص حتمی طور پر کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں خدا نے یہ فرمایا ہے۔ نیز جو کچھ اس نے فرما دیا ہے' اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ کسی قسم کا تضاد نہیں۔

(۲) اب آگے بڑھئے۔ قرآن کریم نے اپنے تمام احکام کی جزئیات کا تعین خود نہیں کیا۔ اکثر اصولاً بیان کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں بعض احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات کا تعین قرآن ہی کے دیگر متعلقہ احکام کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں مطلقہ عورت کی عدت کے متعلق کہا گیا ہے کہ عام حالات میں وہ تین حیض ہے۔ (۲/۲۲۸)۔ لیکن اگر وہ حاملہ ہو تو عدت' وضعِ حمل تک ہے۔ (۶۵/۴)۔

بیوہ کے متعلق کہا ہے کہ اس کی عدت چار مہینے دس

دن ہے۔(۲/۲۳۴)۔لیکن بیوہ اگر حاملہ ہو تو اس کی عدت کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔اس کے لئے کہا جائے گا کہ مطلقہ حاملہ کی عدت پر قیاس کر کے' کہا جا سکتا ہے کہ بیوہ حاملہ کی عدت بھی وضع حمل تک ہوگی۔لیکن اس کے متعلق ہم یہ کہنے کے مجاز نہیں ہوں گے کہ یہ عدت خدا کی مقرر کردہ ہے۔ہم یہی کہہ سکیں گے کہ یہ ہمارا استنباط یا اجتہاد ہے۔

(۳) بعض احکام ایسے ہی ہیں جن کی جزئیات کو بطریق استنباط بھی متعین نہیں کیا جا سکتا۔مثلاً قرآن میں امت مسلمہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ان کے معاملات ان کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔یہاں مشاورت کا اصولی حکم دیا گیا ہے۔اس کا طریق نہیں بتایا گیا۔یہ طریق قرآن کریم کی دیگر آیات سے مستنبط بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا' طریقِ مشاورت امت خود متعین کرے گی۔اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ یہ جزئیات قرآن کریم کے کسی اصول' حکم یا قانون سے ٹکرائیں نہیں۔بالفاظِ دیگر' یہ جزئیات قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کی جائیں گی۔

اس سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہوگا کہ نمبر۲ اور نمبر۳ کی صورت میں استنباطِ احکام یا تعیینِ جزئیات کا حق اور اختیار کسی فرد (یا کسی گروہ) کو نہیں دیا جا سکتا' خواہ وہ فرد کتنا ہی بڑا عالم' فقیہہ' یا مجتہد کیوں نہ ہو۔یہ حق اور اختیار' صرف نظامِ مملکت (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کو حاصل ہوگا۔وہی نظام ان جزئیات کا تعین کرے گا اور وہی ان میں عندالضرورت تغیر و تبدل کا مجاز ہوگا۔اس کے فیصلے ساری امت کے لئے واجب العمل ہوں گے کیونکہ ان کی حیثیت قوانینِ حکومت کی ہوگی۔اس سے امت کی وحدت قائم رہے گی۔

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں' کسی شخص کے اپنے طور پر فیصلے دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔اس کے بعد بھی' اس باب میں اربابِ فکر و نظر کی احتیاط کا کیا عالم تھا' اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔امام اعظمؒ کا فقہ میں جو مقام ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔مؤرخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ ایک دن ان کی صاحبزادی نے کہا کہ ابا جان! میں روزہ سے ہوں۔دانتوں سے خون نکلا اور تھوک کے ساتھ گلے میں اتر گیا۔روزہ جاتا رہا یا باقی رہا۔آپ نے فرمایا کہ بیٹی! اپنے بھائی حمّاد سے پوچھو کہ حکومت کی طرف سے فتویٰ دینے کے مجاز وہ ہیں' میں نہیں۔ان حضرات کی احتیاط کا یہ عالم تھا۔اور اب۔۔۔ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔۔۔جس کا جی چاہا فیصلے کرنے کا مجاز بن بیٹھا۔مذہب میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

☆☆☆

اہل قرآن کی جزئیات

ان تصریحات کے بعد' فرقہ اہل قرآن کے مسلک کی طرف آیئے۔ان کا دعویٰ یہ ہے کہ تمام احکام کی جزئیات قرآن کریم نے خود ہی متعین کر دی ہیں۔یعنی ان کے نزدیک' تصریحات بالا میں شق نمبر۲ اور نمبر۳ (اسلامی نظام کی طرف سے استنباطِ احکام اور تعیینِ جزئیات) خلاف قرآن ہوں گے۔اس

مقام پر ہمارے سامنے ایک دلچسپ حقیقت آتی ہے۔(مولانا) عبداللہ چکڑالوی نے اپنے ہاں اسلامی نظام یا خلافت علیٰ منہاج رسالت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ خالص مذہب کی سطح پر سوچتے تھے اور مذہب میں نظام کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ یکسر انفرادی اور پرائیویٹ معاملہ ہوتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ہمارے دور میں اسلامی نظام کا تصور اجاگر ہوا۔۔۔ علامہ اقبالؒ نے اس کا تصور پیش کیا، علامہ اسلمؒ جیراجپوری نے اس کے تشکیلی خطوط کی وضاحت کی اور اس کی عام نشر و اشاعت کی سعادت طلوعِ اسلام کے حصہ میں آئی۔ دین کا یہ تصور اس قدر معقول، اور اسلام کے آخری اور مکمل دین ہونے کی دلیل اور برہان تھا کہ قدامت پرست مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کے علی الرغم، اربابِ فکر ونظر نے اسے اپنے قلوبِ سلیم میں جگہ دے دی۔ اس کے بعد، محراب ومنبر بھی ان اصطلاحات کے اختیار و استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے اور اسی مجبوری کے ماتحت، (مولانا) چکڑالوی کے متبعین کو بھی ان الفاظ کو دہرانا پڑا لیکن اس سے یہ عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گئے۔ اسلامی نظام کے نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم تسلیم کریں کہ جن احکام کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، وہ انہیں اصولِ مشاورت کے مطابق متعین کرے گا۔ اہل قرآن کا عقیدہ یہ ہے کہ جملہ احکام کی جزئیات قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اس سے یہ سوال سامنے آیا کہ پھر اسلامی نظام کرے گا کیا؟ قرآن نے جو مشاورت کا حکم دیا ہے، اس پر عمل کس طرح سے ہوگا؟ دیکھئے وہ اس کشمکش سے نکلنے کی صورت کیا اختیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

> آنحضورﷺ کو حکم ہوا۔ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹)۔ اور مومنوں کی صفت بیان ہوئی ہے وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)۔ دیکھئے! امر میں مشاورت کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کے حکم میں نہیں۔ حکم کے متعلق تو ارشاد ہوا ہے۔ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (۶/۵۷، ۶۷، ۱۲/۴۰) حکم صرف اللہ کا ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶) اللہ اپنے حکم میں کسی ایک کو بھی شریک نہیں کرتا۔ اس لئے حکم اللہ کا اور جزئیات بندوں کی؟ (العیاذ باللہ)۔ (بلاغ القرآن، بابت فروری ۵۷ء، ص ۲۶)۔

اس کے بعد انہیں یاد آ گیا کہ خود لفظ امر کے معنی حکم ہیں۔ اس کا کیا علاج؟ کہا۔

> لفظ امر کا معنی حکم بھی ہے۔ لیکن چونکہ اللہ کے حکم میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا کہ وہ اس کی جزئیات متعین کرنے بیٹھ جائے، کہ نمازیں پانچ پڑھی جائیں یا تین یا دو یا ایک۔ اس لئے شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۳/۱۵۹)۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُم (۴۲/۳۸) میں آمدہ لفظ امر سے اللہ کا حکم مراد نہیں بلکہ وہ معاملات مراد ہیں جو آنحضورﷺ اور آپ کے جانشینوں کو داخلی یا خارجی معاملات میں وقتاً فوقتاً ہنگامی طور پر پیش آتے تھے۔ (ص ۲۷)۔

آپ نے غور فرمایا کہ ان حضرات کی خالص مذہب پرستانہ

ذہنیت کس طرح پھوٹ پھوٹ کر سامنے آ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے حکومتِ خداوندی کو قائم فرمایا تھا اور اس حکومت کے جس قدر معاملات تھے ان سب کا تعلق ''حکم'' خداوندی سے تھا۔ اس میں ''عبادات'' اور ''امور مملکت'' میں کوئی تمیز و تفریق نہیں تھی۔ صحنِ مسجد ہو یا ایوانِ حکومت (بلکہ میدانِ جنگ) ان میں کاہر معاملہ ''حکم خداوندی'' کے مطابق طے ہوتا تھا۔ ''عبادات'' اور امورِ مملکت کی ثنویت اور مغائرت اس دور کی پیدا کردہ ہے جب حکومتِ خداوندی کی جگہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت نے لے لی تھی۔۔۔ اور یہ حضرات (اہل قرآن) بھی اسی ذہنیت کے مالک ہیں۔ ان کے نزدیک بھی اسلام ایک مذہب ہی ہے۔

اور پھر اس پندارِ نفس پر غور کیجئے! اگر خلافت علیٰ منہاج نبوت' یہ فیصلہ کرے کہ ''نمازیں پانچ پڑھی جائیں یا تین یا دو یا ایک'' تو یہ شرک ہوگا' اور کوئی عبداللہ چکڑالوی یا ماسٹر محمد علی رسول نگری یہی طے کرنے بیٹھ جائے تو یہ عین مطابقِ قرآن ہو گا۔۔۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

لیکن اتنا لکھنے کے بعد ان کے دل میں خود ہی کھٹک پیدا ہوگئی کہ یہ ہم نے کیا کہہ دیا۔ اس کے ازالہ کے لئے فرمایا:

> جب خلافتِ الٰہیہ قائم ہوگی وہ قرآن ہی سے فیصلہ دے گی اور اسے قرآنی جزئیات ہی کے نام سے بصمیم قلب تسلیم کرنا ہوگا۔ (بلاغ القرآن۔ فروری ۷۵ء' ص ۲۹)۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ (خلافتِ الٰہیہ) نماز' روزہ کے متعلق بھی فیصلہ دے گی یا صرف امورِ مملکت کے متعلق ہی فیصلے دے گی؟ کیا نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ ''مذہبی امور'' اس کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہوں گے؟ قرآن کریم نے تو ان اربابِ خلافت کے متعلق کہا ہے کہ الَّذِيْنَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ..... (۲۲/۴۱)۔ جب انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوگا تو یہ ''اقامتِ صلوٰۃ'' اور ایتائے زکوٰۃ۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے لیکن اگر یہ حضرات اس وقت موجود ہوں گے تو ان سے کہہ دیں گے کہ تمہیں صلوٰۃ و زکوٰۃ کے متعلق فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا دائرہ بھی امور مملکت تک محدود ہے۔ تم اگر اس سے تجاوز کر کے' مذہبی امور میں دخیل ہو گے تو مملکت کے خلاف بغاوت کی جائے گی۔ کیونکہ تمہارا ایسا کرنا خلافِ قرآن اور شرک ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگر مزید تفصیل میں جانا مقصود ہوتا تو میں بتاتا کہ قرآن کریم میں ''امر'' دین کے معنوں میں آیا ہے اور اسلامی مملکت دین ہی کی مظہر اور ذریعہ نفاذ ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے جب کہا گیا تھا کہ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا .....(۱۸/۴۵)۔ ''پھر ہم نے تمہیں امر کے ایک راستے پر لگا دیا۔ سو تم اسی کا اتباع کرو''۔ تو اس سے مراد دینِ خداوندی تھا نہ کہ محض امورِ مملکت۔ دوسری طرف جب جماعتِ مومنین سے

استخلاف فی الارض (حکومت ومملکت) کا وعدہ کیا گیا تھا تو اس کی غرض وغایت یہ بتائی گئی تھی' کہ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ (۲۴/۵۵)۔ تاکہ اس سے اس دین کو تمکن حاصل ہو جائے جسے خدا نے ان کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ لہٰذا' امر کو دنیاوی امور تک محدود سمجھنا' دین سے بے خبری کی دلیل ہے۔ ان تمام امور کی جزئیات متعین کرنا' جن کا تعین قرآن کریم نے نہیں کیا' اسلامی نظام پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

☆☆☆

قرآن کے خلاف سنگین الزام

اسے پھر دہرا دیا جائے کہ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم نے تمام احکام کی جزئیات خود ہی متعین کر دی ہیں۔ قرآن کی متعین کردہ جزئیات کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔۔ وہ کس قدر واضح' صاف اور متعین ہوتی ہیں۔۔۔ اس کی مثالیں پہلے دی جا چکی ہیں۔ یہ اس قدر واضح اور متعین ہوتی ہیں کہ ان کے متعلق دو آراء کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً جہاں اس نے کہا ہے کہ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ (۴/۱۱)۔ یعنی ماں کا چھٹا حصہ ہے تو اسے' دو نہیں' دو کروڑ آدمی بھی دیکھیں تو اس کے حصہ کو چھٹا حصہ ہی کہیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ ایک شخص چھٹا حصہ کہہ دے اور دوسرا آٹھواں حصہ۔ اس تصریح کے بعد اب نماز کی ان جزئیات کو لیجئے جسے ان حضرات کے نزدیک قرآن نے متعین کیا ہے۔ (مولانا) چکڑالوی نے قرآن کریم کی آیات (۱۱/۱۱۴) اور (۱۷/۷۸) سے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ وقتوں کی نماز کا حکم دیا ہے اور بلاغ القرآن والوں نے انہی دو آیتوں کو درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں تین وقتوں کی نماز فرض قرار دی ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ یہ قرآن کا قطعی فیصلہ ہے۔ یا مثلاً (مولانا) چکڑالوی نے سورۂ النساء کی آیات (۱۰۲۔۴/۱۰۱) درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ خدا نے ان میں حکم دیا ہے کہ نماز کی چار رکعتیں ہیں اور بلاغ القرآن نے انہی آیات کے درج کرنے کے بعد کہا ہے کہ خدا نے نماز کی دو رکعتیں مقرر کی ہیں۔ اسی طرح (مولانا) چکڑالوی نے کہا ہے کہ خدا نے ایک رکعت میں دو سجدوں کا حکم دیا ہے اور بلاغ القرآن نے بتایا ہے کہ خدا نے ایک رکعت میں ایک ہی سجدہ کا حکم دیا ہے۔

سوچئے کہ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کر دے کہ کیا آپ کے خدا کو یہ کہنا بھی نہیں آتا کہ نماز کے کتنے اوقات ہیں' کتنی رکعتیں اور کتنے سجدے۔ تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ اگر قرآن کی یہی حالت ہے کہ اس کی ایک ہی آیت سے پانچ وقت اور تین وقت یا چار رکعتیں اور دو رکعتیں۔ یا دو سجدے اور ایک سجدہ ثابت ہو جاتا ہے تو ایسے قرآن کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور قائم ہوگا؟ لیکن ان حضرات کو اس سے کیا غرض کہ ان کی اس قسم کی حرکتوں سے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور قرآن کریم کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ انہیں تو ایک جدید فرقہ کی تشکیل اور اس کی امامت سے غرض ہے۔ اور بس!

مندرجہ بالا آیات میں تو پھر بھی صلوٰۃ کے الفاظ آتے ہیں لیکن جب ہم ان کی بیان کردہ ''اذکارِ صلوٰۃ'' کی طرف آتے

ہیں تو وہاں اس سے بھی زیادہ حیرت افزاء اور تأسف انگیز صورت سامنے آتی ہے۔ سورہ نمل میں ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ کا گزر وادیٔ نمل پر سے ہوا اور اس قوم کی سربراہ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ تم اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاؤ ورنہ سلیمانؑ کا لشکر تمہیں کچل دے گا تو حضرت سلیمانؑ اس کی غلط نگہی پر متبسم ہوئے اور اس کے ساتھ ہی خدا سے دعا کی کہ۔۔۔رَبِّ أَوْزِعْنِیْ أَنْ أَشْکُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْ أَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلَی وَالِدَیَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحاً تَرْضَاهُ (۱۹/ ۲۷)۔ ''اے میرے رب! مجھے اس کی توفیق عطا فرما کہ تو نے جس نعمت سے مجھے اور میرے والدین کو نوازا ہے' اس کا شکر ادا کروں اور تیری پسند کے مطابق عمل صالح کروں''۔ یہی الفاظ کچھ اضافے کے ساتھ سورۂ احقاف (۴۶/۱۵) میں زمین کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں۔ ان مقامات میں نہ کہیں صلوٰۃ کا ذکر ہے' نہ رکوع وسجود کا۔ لیکن ''بلاغ القرآن'' والوں کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو رکوع کی حالت میں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ہم نے صرف ایک مثال پیش کی ہے۔ ورنہ انہوں نے دعائے قبلِ صلوٰۃ سے اذکار بعد صلوٰۃ تک اسی طرح سے مختلف آیتیں درج کی ہیں اور اس کے بعد کہا ہے کہ یہ ہے قرآن کا مقرر کردہ صلوٰۃ کا طریق۔

اگر یہ حضرات یہ کہتے کہ ہم نے قرآن کریم میں غور و فکر کیا ہے جس کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ نماز میں اس قسم کی دعائیں پڑھنی چاہئیں تو یہ اور بات ہوتی لیکن ان کا کہنا تو یہ ہے کہ یہ خدا کا حکم ہے کہ نماز میں حالتِ قیام میں یہ پڑھو' رکوع میں یہ پڑھو اور سجدہ میں یہ کہو۔ اپنے قیاس کو خدا کا حکم کہہ کر پیش کرنا اتنی بڑی جسارت ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں اس کا بھی قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ جب کل کو اللہ تعالیٰ یہ پوچھے گا کہ میں نے کب کہا تھا کہ قیام میں یہ آیتیں پڑھو اور رکوع اور سجدے میں یہ آیتیں تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟ قرآنی آیات کے ساتھ اس قسم کا کھیل مرزا غلام احمد کھیلا کرتے تھے۔ (مثلاً) وہ کہتے تھے کہ قرآنی آیت۔۔۔ھو الذی ارسل رسولہ' بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ' علی الدین کلہ۔ میں' مجھے رسول کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (براہین احمدیہ' ص ۴۹۸ و اعجاز احمدی) وقس علیٰ ذالک۔ لیکن وہ تو اپنے اس قسم کے دعاوی کی دلیل اور سند یہ پیش کرتے تھے کہ انہیں اس کی بابت خود خدا نے بذریعہ وحی بتایا ہے۔ معلوم نہیں کہ بلاغ القرآن والوں کے پاس اس کی کیا سند اور ثبوت ہے کہ خدا نے حکم دیا ہے کہ تم نماز میں فلاں آیات پڑھا کرو۔ قرآن کریم میں تو ایسا کہیں نہیں آیا؟

چونکہ قارئین طلوع اسلام کے دل میں یہ خواہش ابھرے گی کہ وہ کون سی آیات ہیں جن پر ان کی وضع کردہ نماز مشتمل ہے' ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس مقالہ کے آخر میں ان کے بیان کردہ اذکار صلوٰۃ درج کر دیئے جائیں۔ قارئین' ان آیاتِ قرآنی کو دیکھیں اور پھر سوچیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کسی ایک جگہ بھی یہ کہا ہے کہ انہیں نماز میں یوں پڑھو۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ یہ خدا کی مقرر کردہ

جزئیات ہیں' کتنی بڑی جسارت ہے۔ قرآن کریم نے یہودی فقیہوں کے متعلق کہا تھا کہ یَکْتُبُونَ الْکِتَابَ بِأَیْدِیھِمْ ثُمَّ یَقُولُونَ ھَذَا مِنْ عِندِ اللّٰہِ (۲/۷۹)۔ ''وہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے''۔ کیا اسی قبیل کی جسارت ان اہل قرآن کی نہیں کہ یہ اپنے ذہن سے تجویز کرتے ہیں کہ فلاں آیات نماز میں پڑھی جانی چاہئیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی تجویز کردہ آیاتِ صلوٰۃ ہیں۔ (عیاذا باللہ)۔

☆☆☆

فرقہ سازی

قرآن کریم نے بالفاظِ صریح فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (۳۲-۳۱/۳۰) اور متعدد آیات میں اس کی سخت مخالفت کی ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت ان آیات کو لوگوں کے سامنے نہیں لاتی تھی۔ طلوع اسلام نے اسے اس شد و مد سے دہرایا اور ان کا اتنا چرچا کیا کہ لوگوں نے مولوی صاحبان سے پوچھنا شروع کر دیا کہ ان آیات کی موجودگی میں' اسلام میں فرقوں کا کیا جواز ہے؟ اس اعتراض کا کوئی جواب ان سے بن نہیں پڑتا تھا۔ اس سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ اور (یہ تو معلوم نہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو فریب دے لیا یا نہیں لیکن) لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کرنا شروع کر دیا کہ ہمارے ہاں مذہبی فرقے نہیں' مکاتبِ فکر ہیں۔ عوام بیچاروں کو کیا معلوم کہ مکاتبِ فکر کیا ہوتے ہیں اور مذہبی فرقے کیا۔۔۔ چنانچہ آج کل اس کا چرچا عام کیا جا رہا ہے اور اس طرح کبوتر آنکھیں بند کر کے مطمئن ہو بیٹھا ہے کہ بلی کا خطرہ ٹل گیا ہے۔

مکاتب فکر سے کیا مراد ہے

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم نے اپنی آیات کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔۔ متشابہات اور محکمات۔۔ آیاتِ متشابہات کا تعلق کائنات اور مابعد الطبیعات کے ان بسیط حقائق سے ہے جنہیں تشبیہی انداز ہی میں بیان کیا جا سکتا تھا۔ ان حقائق کا مفہوم ہر شخص اپنی اپنی فکر کے مطابق سمجھ سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ فکر انسانی' انسانی علوم کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ وسیع اور بلند ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ان آیات میں بیان کردہ حقائق کا مفہوم بھی ہر دور میں وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان حقائق' نیز احکامِ قرآنی کے معارف و مصالح پر اسطرح غور و فکر کرنے والوں کو مفکرین کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے فکری اختلاف کی بنا پر کوئی فرقہ وجود میں نہیں آتا۔ مسلم مفکرین میں ابن باجہ' ابن رشد' ابن سینا' ابن طفیل' ابن مسکویہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ انہوں نے کوئی مذہبی فرقہ پیدا نہیں کیا۔ ہمارے دور میں سرسیدؒ اور اقبالؒ کا شمار بھی مشہور مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کے مکاتبِ فکر (Schools of Thought) تو اپنے اپنے ہیں لیکن یہ کسی فرقے کے بانی نہیں ہیں۔

اس کے برعکس فرقہ وجود میں آتا ہے محکمات میں اختلاف کی بنا پر۔ اس میں عقائد کے اختلاف بھی شامل ہیں اور اعمال کے اختلاف بھی۔ یہی وہ فرقہ بندی ہے جسے قرآن نے

شرک قرار دیا ہے کہ اس سے امت کی وحدت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ان فرقوں کے نشاناتِ تعارف تو الگ الگ ہیں لیکن یہ محسوس طور پر نکھر کر سامنے آتے ہیں نماز کے وقت۔ مسلمانوں کا دو چار ہزار کا مجمع بھی کسی جگہ ہو تو آپ پہچان نہیں سکیں گے کہ کون کس فرقے سے متعلق ہے۔ لیکن جونہی نماز کی اذان ہو گی تو یہ اٹھ کر الگ الگ مسجدوں کا رخ کر لیں گے اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کون کس فرقے سے متعلق ہے۔ مختلف فرقوں کی نمازوں میں بھی فرق ہوتا ہے لیکن تفرقہ کے لئے یہ فرق بھی ضروری نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ دو فرقوں کی نماز میں کوئی فرق نہ ہو لیکن اس کے باوجود ان میں بعد المشرقین ہو۔ مثلاً ''احمدیوں'' نے اپنی نماز وہی رکھی جو حنفی مسلمان پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی مسجدیں الگ بنائیں۔ نماز میں فرقہ بندی کی بنیاد یہ ہے کہ ایک فرقہ کے مسلمان دوسرے فرقہ کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھتے۔ یا یوں کہئے کہ دوسرے فرقہ کے امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اس لئے ان کی مسجدیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں اور جماعتیں بھی الگ الگ۔ یوں نماز مختلف فرقوں کا تعارفی نشان بن جاتی ہے۔ امت میں تفریق کی جو پہلی اینٹ رکھی گئی تھی وہ مسجد ہی کی اینٹ تھی جسے قرآن نے ''مسجدِ ضرار'' کہہ کر پکارا اور کفر قرار دیا ہے۔ (۹/۱۰۷)۔

جس طرح باقی مذہبی فرقے' فرقے کے نام سے تلملا اٹھتے ہیں' اسی طرح اہل قرآن کے لئے بھی یہ لفظ آتش بہ پیرہن ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اٹھتے بیٹھتے کہتے رہتے ہیں کہ ہم فرقہ نہیں۔ چنانچہ بلاغ القرآن نے اپنی اشاعت بابت فروری ۱۹۷۵ء میں لکھا ہے کہ:

> طلوع اسلام نے جنوری ۱۹۷۵ء کے صفحہ ۴۸ پر عنوان قائم کیا ہے۔ فرقہ اہل قرآن۔ اور وہ ہمیں فرقہ کہتے کہتے تھکتا نہیں۔ حالانکہ ہم بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم فرقہ نہیں ہیں۔ (صفحہ ۲۲)۔

وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

> اگر طلوع اسلام الگ درسوں' الگ کنونشنوں' الگ اسٹیجوں اور الگ بزموں کے باوجود فرقہ نہیں تو بلاغ القرآن صرف قرآن کی فرض کی ہوئی نماز کی ادائیگی کی بدولت فرقہ کس طرح ہو گیا۔ (بلاغ القرآن' بابت دسمبر ۱۹۷۴ء' ص ۳۰)۔

نماز کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ:

> بعض لوگ کہتے ہیں کہ نماز فرقہ بندی سکھاتی ہے۔ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں انہیں غلطی لگ چکی ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی عقائد کے اختلاف سے پیدا ہوتی ہے' نماز سے نہیں۔ (پمفلٹ۔۔الصلوٰۃ' ص ۱۵۔۱۴)۔

یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کون کہتا ہے کہ نماز فرقہ بندی سکھاتی ہے لیکن' جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے' ہر فرقہ نماز کی علیحدگی سے پہچانا جاتا ہے۔ یعنی فرقے کی پہچان یہ ہے کہ وہ دوسرے فرقوں کے ساتھ مل کر یا ان کے امام کے پیچھے نماز نہیں

پڑھتا۔اسی لئے ان کی جماعت بھی الگ ہوتی ہے اور مسجدیں بھی الگ۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ کیا اہل قرآن کی نماز کی صورت یہی نہیں کہ وہ نہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھتے ہیں نہ کسی دوسرے امام کے پیچھے۔ کیا اسی بنا پر انہوں نے اپنی مسجد الگ نہیں بنائی اور کیا اس میں اسی فرقہ کے لوگوں پر مشتمل الگ نماز کی جماعت نہیں ہوتی۔ اگر یہ فرقہ بندی نہیں تو پھر کیا فرقوں کے سر پر سینگ ہوتے ہیں؟ نماز میں علیحدگی کی کیفیت یہ ہے کہ (مثلاً) اہل حدیث اور حنفی فرقوں کی نمازوں میں اختلاف ہے لیکن وہ اختلاف ایسا معمولی سا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یا دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن فرقہ اہل قرآن کی نماز کی یہ کیفیت ہے کہ وہ دعائے قبل الصلوٰۃ سے لے کر آخری سلام تک تمام مسلمانوں کی نمازوں سے یکسر مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے (اور اس مقالہ کے آخر میں آپ دیکھیں گے) سورۃ فاتحہ کے سوا' ان کی نماز اور دوسرے مسلمانوں کی نماز میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں۔ حتیٰ کہ ان کی نماز جنازہ بھی الگ ہے۔ یہ عجیب دلچسپ بات ہے کہ مسلمانوں میں پہلا فرقہ اہل تشیع کا وجود میں آیا۔ ان کی نماز' دوسرے مسلمانوں کی نماز سے اس قدر مختلف ہے کہ یہ اگر چاہیں بھی تو آپس میں مل کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ [1] اور اس کے بعد اب (سردست) آخری فرقہ اہل قرآن کا وجود میں آیا۔ یہی کیفیت ان کی نماز کی ہے۔ یہ اگر چاہیں بھی تو دوسروں کے ساتھ مل کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔ نہ ہی کوئی دوسرا ان کی نماز میں شریک ہو سکتا ہے۔ کیفیت ان کی یہ ہے اور اس کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ ہم الگ فرقہ نہیں۔ یہ بعینہٖ وہی شکل ہے جو ''احمدیوں'' نے اختیار کر رکھی تھی اور قریب سو برس سے کہتے چلے آ رہے تھے کہ ہم مسلمانوں سے الگ نہیں ہیں۔ ''بلاغ القرآن'' والے بار بار طلوع اسلام کا ذکر کر کے لوگوں کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ ان پر واضح ہونا چاہئے کہ طلوع اسلام الگ سٹیجوں' الگ بزموں' الگ کنونشنوں اور الگ درسوں کے باوجود کوئی فرقہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے نماز روزہ وغیرہ میں کوئی نیا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ یہ خالص فکری تحریک ہے۔ اس لئے اس میں فرقہ بندی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس کے درسوں۔ بزموں کنونشنوں میں ہر فرقہ کے مسلمان شامل ہوتے ہیں اور اپنے اپنے طریقہ پر ارکانِ اسلام کی ادائیگی کرتے ہیں۔ اس باب میں اس کی شدتِ احتیاط کا یہ عالم ہے کہ یہ اپنے اجتماعات میں نماز با جماعت کا کوئی اہتمام نہیں کرتا اور ان میں شامل ہونے والوں سے تاکیداً کہتا ہے کہ وہ آس پاس کی مسجدوں میں جا کر نماز پڑھیں۔ وہ ڈرتا ہے کہ آج کا نماز کا الگ اہتمام کل کو کہیں امت سے علیحدگی کا نشان نہ قرار پا جائے۔ [2]

☆☆☆

[1] ان کی نماز اور دیگر مسلمانوں کی نماز میں سورۂ فاتحہ۔ اس کے بعد کوئی سی قرآنی سورۃ اور رکوع وسجود کی تسبیحات (تھوڑے سے فرق کے ساتھ) مشترک ہیں۔ باقی جزئیات اس قدر مختلف ہیں کہ شیعہ اور غیر شیعہ اکٹھے نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔

[2] ہم نے اس گفتگو کو ان لوگوں کی (بزعمِ خویش) نماز سے متعلق ''قرآنی تفصیلات'' تک محدود رکھا ہے۔ اسی سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ انہوں نے دیگر احکام کی جزئیات کے متعلق بھی کیا گل نہیں کھلائے ہوں گے۔

ملخص

داستان دراز ہوگئی۔ اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس فرقہ نے قرآن کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے عقیدہ اور عمل کی رو سے:

(۱) قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہی باطل قرار پاجاتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں اور جب اس کا یہ دعویٰ باطل قرار پا جائے تو وہ خود اپنے بیان کے مطابق منزل من اللہ رہتا ہی نہیں۔

(۲) قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ نہایت واضح اور روشن کتاب ہے۔ اس میں کسی قسم کا ابہام نہیں، التباس نہیں، ریب نہیں، تشکیک نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے جس شکل میں قرآن کو پیش کیا ہے اس سے اس کے یہ تمام دعاوی باطل قرار پاجاتے ہیں۔

(۳) اس سے پہلے کسی فرقہ کے بانی نے بھی اپنے قیاس، اجتہاد و یا استنباط کے متعلق یہ نہیں کہا تھا کہ وہ خدا کے ارشادات ہیں (بجز مدعیانِ نبوت کے) لیکن ان کی صورت یہ ہے کہ یہ اپنے ذہن سے ایک بات تجویز کرتے ہیں، و یقولون ھذا من عند اللہ۔ اور کہتے یہ ہیں کہ وہ خدا کا حکم اور قرآن کا فیصلہ ہے۔

(۴) انہوں نے ایک ایسی نماز ایجاد کی ہے جس میں کوئی دوسرا مسلمان ان کے ساتھ شریک ہی نہیں ہوسکتا۔ نہ ہی یہ دوسرے مسلمانوں کی ساتھ مل کر نماز ادا کر سکتے ہیں۔ یہ فرقہ بندی کی شدید ترین شکل ہے۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ قرآن اور ملت کے خلاف اس سے بڑی دشمنی کچھ اور بھی ہوسکتی ہے؟ اس دور میں قرآنی روشنی بہت دور تک پھیل جاتی اگر یہ لوگ اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے نہ ہوجاتے۔

☆☆☆

میرا نظریہ اور مسلک

آخر میں، میں اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق ان امور کے متعلق کیا سمجھا ہے۔ واضح رہے کہ میں نے اپنے فہم قرآن کو نہ کبھی حرفِ آخر قرار دیا ہے نہ سہو و خطا سے منزہ۔ میں نے نہ کوئی الگ فرقہ قائم کیا ہے نہ ہی میں کسی فرقے سے متعلق ہوں۔ نہ ہی میرا، قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے سوا کوئی اور دعویٰ ہے۔ جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں اور جس کی میں تبلیغ کرتا چلا آ رہا ہوں وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) قرآن کریم تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ضابطۂ حیات ہے۔ اس بنا پر یہ خدا کی طرف سے آخری کتاب اور حضور نبی اکرم ﷺ اس کے آخری نبی اور رسول ہیں۔ وحی کا سلسلہ حضور ﷺ کی ذات پر ختم ہوگیا۔

(۲) قرآن کریم میں احکام و قوانین کے علاوہ کائناتی حقائق بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان حقائق (اور احکام

قرآنی کے مصالح) کو ہر فرد اپنے غور وفکر کی رو سے سمجھ سکتا ہے۔ مختلف افراد اور مختلف زمانوں میں اس فکر میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کی وجہ سے امت میں کوئی تفریق نہیں پیدا ہونی چاہئے۔

(۳) جہاں تک قرآنی احکام کا تعلق ہے انہیں اس نے نہایت واضح اور محکم انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ان میں نہ کسی قسم کا اختلاف اور تضاد ہے' نہ ابہام و التباس۔

(۴) ان احکام میں بعض ایسے ہیں جن کی جزئیات تک بھی قرآن نے خود متعین کر دی ہیں۔ یہ جزئیات بھی نہایت واضح' روشن اور غیر مبہم ہیں۔ دوسرے احکام ایسے ہیں جنہیں اصولی طور پر دیا گیا ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہے کہ ان کی جزئیات اسلامی نظام مملکت خود متعین کرے' اس شرط کے ساتھ کہ وہ قرآن کے کسی اصول' حکم یا تعلیم سے ٹکرائیں نہیں۔ ان جزئیات میں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ عندالضرورت تبدیلی ہوسکتی ہے۔ لیکن ان کا تعین ہو یا تغیر وتبدل' اس کا اختیار صرف اسلامی نظام کو حاصل ہے' کسی فرد یا کسی گروہ کو نہیں۔

(۵) ان جزئیات کو سب سے پہلے نظامِ اسلامی نے' عہد رسالتمآب ﷺ و خلافتِ راشدہ میں متعین کیا۔ امت کی بدقسمتی سے یہ نظام کچھ عرصہ کے بعد باقی نہ رہا اور اس طرح امت کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ اور دین' مذہب میں بدل گیا۔ اس زمانے میں بعض حضرات کی ذاتی کوششوں کی بنا پر صدرِ اول کے ان فیصلوں کو زبانی روایات کی رو سے جمع اور مرتب کیا گیا۔ انہیں روایات کے مجموعے کہا جاتا ہے۔

(۶) ان مجموعوں میں وضعی روایات بھی شامل ہوگئی ہیں۔ میرے نزدیک ان کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو روایات کسی شکل میں بھی قرآن کریم سے ٹکرائیں' ان کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات نہیں۔ انہیں حضور ﷺ یا صحابہؓ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے جو اقوال واعمال قرآن سے نہ ٹکرائیں' انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ واضح رہے کہ میں احادیثِ رسول اللہ ﷺ کا منکر نہیں۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جو روایات قرآن کے خلاف ہیں' رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کی نسبت غلط ہے۔ وہ حضور ﷺ کے ارشادات ہو نہیں سکتے۔

(۷) مسلمانوں میں اس وقت متعدد فرقے پیدا ہو چکے ہیں اور یہ صورت قرآن کے خلاف اور دین کے منافی ہے۔ قرآن کا تصور وحدتِ امت کا ہے۔ لیکن امت میں وحدت صرف اسلامی نظام کے ذریعے پیدا ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ وہ نظام پھر سے متشکل ہو جائے۔

(۸) یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب تک وہ نظام قائم نہ ہو ہم کیا کریں۔ اس سلسلہ میں میرا نظریہ اور مسلک یہ ہے کہ مختلف فرقے جس جس طریق سے ارکان اسلام کی پابندی کرتے چلے آ رہے ہیں' ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے۔ نہ ان میں کوئی تبدیلی تجویز کی جائے اور نہ کوئی نیا طریقہ وضع کیا جائے۔ ایسا کرنے سے بجز اس کے کہ امت میں مزید انتشار پیدا ہو کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے' اس قسم کا اختیار صرف اسلامی نظام کو حاصل ہے' کسی فرد یا فرقے کو حاصل نہیں۔ اپنے اس نظریہ کے مطابق میں خود بھی ارکانِ اسلام کی پابندی دوسرے مسلمانوں کی طرح کرتا ہوں اور جو لوگ میری بات سنتے ہیں' ان سے بھی یہی تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان کی پابندی اسی طریق سے کرتے چلے جائیں۔ البتہ جو عقائد یا شعائر قرآن کے خلاف نظر آئیں ان کی نشاندہی کی جائے اور ان کی جگہ قرآن کی صحیح تعلیم کو عام کیا جائے۔ میں قریب چالیس سال سے یہی کچھ کرتا چلا آ رہا ہوں اور یہی تحریکِ طلوع اسلام کا مقصود و منتہیٰ ہے۔

(۹) تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ میرے ایمان کا جزو اور قرآن کریم کے بلند و بالا و منفرد مقام کا عام کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔ جہاں ان پر کسی قسم کی زد پڑتی ہے' اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق اس کی مدافعت کی کوشش کرتا ہوں۔ ''احمدیوں'' اور فرقہ اہل قرآن کے خلاف میری جدوجہد کا جذبۂ محرکہ بھی یہی ہے اور مقصود و منتہیٰ بھی یہی۔ میری کسی سے نہ ذاتی دشمنی ہے نہ جذبۂ انتقام۔ اسی لئے میں ان بحثوں میں ذاتیات پر نہیں اترا کرتا۔

(۱۰) آخر میں' میں اسے پھر دہراتا ہوں کہ امت میں دین کے قیام کی صورت قرآنی نظام کے قیام کے سوا کچھ نہیں۔ وہی امت میں وحدت پیدا کرے گا اور اسے ایک طریق پر چلائے گا۔ امت کا موجودہ انتشار' گروہ سازیاں اور فرقہ بندیاں' نئے نئے اختلافات کی نمود' نئی نئی نمازوں کی اختراع' اردو میں نماز' یہ سب اس لئے ہے کہ امت میں قرآنی نظام باقی نہیں رہا۔ وہ نظام قائم ہوگیا تو یہ سب افتراق و انتشار ختم ہوجائے گا۔

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے!

☆☆☆

تتمّہ

فرقہ اہل قرآن کی نماز

(۱) تین وقتوں کی نماز۔ اذان کی ضرورت نہیں۔ اللہ اکبر

کہنا خلافِ قرآن ہے۔

(۲) ایک نماز میں دو رکعتیں۔

(۳) ایک رکعت میں ایک سجدہ۔

(۴) اذکارِ صلوٰۃ۔ (جو ان کے شائع کردہ پمفلٹ الصلوٰۃ میں درج ہیں)۔

دعائے قبل صلوٰۃ معہ تکبیر صلوٰۃ: بسم اللہ الرحمن الرحیم o رب ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا o ان اللہ کان علیا کبیرا o۔

اذکارِ قیام

اسماء حسنیٰ اور تسبیح: ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ ھو الرحمن الرحیم o ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون o ھو اللہ الخالق البارئ المصور لہ الاسماء الحسنیٰ یسبح لہ ما فی السمٰوٰت والارض و ھو العزیز الحکیم o

حمد۔ استعانت و استغفار: بسم اللہ الرحمن الرحیم o الحمد للہ رب العالمین o الرحمن الرحیم o مالک یوم الدین ایاک نعبد وایاک نستعین o اھدنا الصراط المستقیم o صراطا الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین o ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار o سمعنا واطعنا غفرانک ربنا والیک المصیر o ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا ربنا ولا تحمل علینا اصرا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفرلنا وارحمنا انت مولٰنا فانصرنا علی القوم الکٰفرین o ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب o ربنا انک جامع الناس لیوم لا ریب فیہ ان اللہ لا یخلف المیعاد o ربنا اننا امنا فاغفرلنا ذنوبنا وقنا عذاب النار o ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا و ثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکٰفرین o ربنا افرغ علینا صبرا و توفتا مسلمین o ربنا امنا فاغفرلنا وارحمنا و انت خیر الراحمین o رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین o ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غراما o انھا ساء ت مستقرا و مقاما o ربنا وسعت کل شئی رحمۃ و علما

فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک وقهم عذاب الجهیم۔ ربنا وادخلهم جنت عدن التی وعدتهم ومن صلح من اباء هم وازواجهم و ذریٰتهم انک انت العزیز الحکیم o وقهم السیٰات ومن تق السیٰات یومئذ فقد رحمته و ذالک هو الفوز العظیمo۔

اذکارِ رکوع انابتِ الی اللہ: رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلیٰ والدی وان اعمل صالحا ترضٰه واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیک وانی من المسلمین ربنا علیک توکلنا والیک انبنا و الیک المصیر ربنا لا تجعلنا فتنة للذین کفروا واغفرلنا ربنا انک انت العزیز الحکیم۔

اذکارِ سجدہ۔ تسبیح اور حمد: سبحٰن ربنا ان کان وعد ربنا لمفعولا الحمد لله الذی لم یتخذ ولدا و لم یکن له شریک فی الملک ولم یکن له ولی من الذل ربنا اصرف عنا عذاب جهنم ان عذابها کان غراما انها ساء ت مستقرا و مقاما o ربنا هب لنا من ازواجنا و ذریٰتنا قرة اعین واجعلنا للمتقین اماما o۔

اذکار بعد الصلوٰۃ: رب اعوذبک من همزات الشیٰطین o واعوذبک رب ان یحضرون o ربنا ما خلقت هذا باطلا۔ سبحٰنک فقنا عذاب النار o ربنا انک من تدخل النار فقد اخزیته وما للظلمین من انصار o ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان اٰمنوا بربکم فامنا ربنا فاغفرلنا ذنوبنا وکفرعنا سیاتنا و توفنا مع الابرار۔ ربنا واٰتنا ما وعدتنا علی رسلک ولا تخذنا یوم القیمٰة انک لا تخلف المیعادo۔

رسولوں پر سلام: سلام علی المرسلینo والحمد لله رب العالمینo۔

حاضر مومنوں پر سلام: سلام علیکم کتب ربکم علی نفسه الرحمة لا انه من عمل منکم سوء بجهالة ثم تاب من بعده واصلح فانه غفور رحیمo۔

صلوٰۃ میت کے اذکار: ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین اٰمنوا ربنا انک رء وف رحیم o (۵۹/۱۰)۔

☆☆☆

طلوع اسلام: ان لوگوں سے صرف اتنا پوچھئے کہ ان میں سے

کسی ایک ذکر کے متعلق بھی خدا نے کہا ہے کہ اسے نماز کے قیام' رکوع' سجدہ وغیرہ میں پڑھا جائے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کہا تو آپ کس طرح کہتے ہیں کہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے! یہ خدائی اختیارات کا حامل بن جانا نہیں تو اور کیا ہے؟

لیکن ان لوگوں سے قطع نظر' ہم ان سادہ لوح مسلمانوں سے' جو ان کے اس چکر میں پھنس کر' ان کی تجویز کردہ نماز کو خدا کی مقرر کردہ صلوٰۃ سمجھنے لگے ہیں' دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے کبھی سوچا بھی کہ آپ کو ان لوگوں نے کس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ آپ دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان ہی نہیں' آپ دنیا کے کسی ملک میں' کسی مسجد میں بھی' مسلمانوں کے ساتھ نماز میں شامل نہیں ہو سکتے۔ حتیٰ کہ حریم کعبہ میں بھی ان کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ کیونکہ آپ کی نماز ہی دنیا جہان سے نرالی ہے۔ حتیٰ کہ آپ نماز جنازہ تک میں باقی مسلمانوں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ سوچئے کہ انہوں نے کس چابک دستی سے آپ کا رشتہ ساری امت سے منقطع کر دیا ہے جو نماز جمہور مسلمان پڑھ رہے ہیں' وہ کونسی کافرانہ اور مشرکانہ ہے جو انہوں نے آپ کو یہ پٹی پڑھا کر شجر ملت سے کاٹ کر رکھ دیا! ہمارے زمانے میں ''احمدیوں'' نے اپنا رشتہ مسلمانوں سے منقطع کیا تھا لیکن انہوں نے مسلمانوں سے کٹ کر اپنی الگ امت بنا لی' سوچئے کہ آپ مسلمانوں سے الگ ہو کر کیا کریں گے؟ لہٰذا' میری آپ سے دردبھری پکار یہ ہے کہ آپ اپنی حالت پر نظر ثانی کریں۔ اللہ کے حضور اپنے اس جرم عظیم کی معافی مانگیں (کہ اس کے ہاں تفرقہ شرک ہے اور شرک ظلم عظیم) اور شجرِ ملت سے پیوستہ رہیں۔ اس کی اولین علامت نماز میں شرکت ہے۔ جس فرقہ کی نماز بھی آپ کو آتی ہے اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھیں اور دیگر فرقوں کے ساتھ نماز پڑھنے میں بھی کوئی حرج نہ سمجھیں۔ یہی سلامتی کی راہ ہے۔

میں نے یہ مقالہ آپ احباب کی بہی خواہی کے لئے لکھا ہے' ورنہ بلاغ القرآن سے کسی بحث میں الجھنے کی نہ مجھے فرصت ہے' نہ ضرورت۔

والسلام

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالب القرآن فی دروس الفرقان پر تبصرہ

اس کتاب کا مقصد علامہ غلام احمد پرویز کے درسِ قرآن کے سلسلے میں آڈیو/ ویڈیو ٹیپ کے ذریعہ محفوظ شکل کا تحریری شکل میں ہم تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ یہ دروس ان کے ان خطاب پر مشتمل ہے جو انہوں نے اپنی زندگی میں 25 بی' گلبرگ لاہور میں حلقہ درس سے وابستہ احباب کی موجودگی میں دیئے تھے۔ انہی آڈیو ٹیپ شدہ سے محفوظ دروس کے الفاظ کو کمپیوٹر کی مدد سے کمپوز کر کے تحریری شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ دروس میں تقریر اور کتابی شکل میں تحریر کی زبان میں فرق ہوتا ہے' لہٰذا ایسی کوشش میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ تقریر کی نسبت تحریر میں الفاظ کے انتخاب میں انسان زیادہ سمجھ بوجھ کے ساتھ احتیاط برتتا ہے۔ لہٰذا تقریری پہلو لئے ہوئے دروس کو کتابی شکل میں منتقل کرنے کی کوشش پر بعض احباب کی طرف سے احتیاط ملحوظ رکھنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس ضمن میں سلسلہ مطالب الفرقان کی مثال' جس میں خود پرویز صاحب کی ذات نے دروس کی روشنی میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ اسے مرتب کیا تھا' کو سامنے رکھتے ہوئے محترم پرویز صاحب کی غیر موجودگی میں اس مساعی سے اجتناب کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔

احباب کے احتیاط برتنے کا مشوہ صائب تھا' لیکن ان دروس کا تحریری شکل میں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے محترم پرویز صاحب پر تحقیقی پہلو سے جائزہ لینے میں اس مواد سے استفادہ نہیں ہو رہا تھا' اس کی کمی کو دور کرنے کے سلسلے میں محترم اشرف ظفر صاحب کی کاوش کی جتنی بھی تعریف کی جائے' وہ کم ہوگی۔ تحقیق کے طالب علموں کے لئے دروس کی تحریری شکل میں مطالب الفرقان فی دروس الفرقان میں منتقلی کا سلسلہ علمی خزائن کا ذخیرہ لئے ہوئے ہے اور مستقبل کے دور کا انسان اسے سامنے پا کر یقیناً اپنی خوشی کا اظہار کرے گا۔

محترم پرویز صاحب کے خطابات دروس کی شکل میں بھی الفاظ کے انتخاب میں پوری احتیاط لئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کی تقریر کو تحریر میں منتقل کرتے ہوئے پیغام (Contents) میں غلطی کا کم ہی امکان رہتا ہے۔ محترم

پرویز صاحب کے دروس اسی لحاظ سے بھی اپنے پیغام میں واضح اور مکمل تصور لئے ہوتے ہیں' کیونکہ محترم پرویز صاحب کے سامنے اس محفوظ پیغام کا مقصد مستقبل کے نوجوان کی راہنمائی پر مرکوز رہا ہے۔ ان کی تحقیقی قدر کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ تحریر میں تحقیقی مواد تک دستیابی آسانی سے ہو جاتی ہے' جس کو سامنے لانے میں بھی دشواری نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس تقریری مواد تک دستیابی اور اس کی تحقیق میں حوالے دینے کی مشق بھی مشقت طلب ہوتی ہے اور اس کے حوالے کی صحت وصداقت کی جانچ پڑتال بھی۔ اس کتاب میں دروس کی تقریر کو تحریر میں لانے میں پوری دیانتداری سے کام لیا گیا ہے اور اس کی باقاعدہ جانچ کے لئے مدیر' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق نے بہت محنت کی ہے۔ اس جانچ کی مزید پڑتال بھی کرانے کے فرض سے' محترم اشرف ظفر صاحب نے کوتاہی نہیں برتی۔ اس سلسلے میں البتہ مدیر' پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق نے جا بجا Foot Note کے ذریعے بعض جگہ وضاحتیں پیش کی ہیں' جو بیشتر درس کا براہ راست حصہ نہ ہونے کی وجہ سے قاری کی توجہ کو بدلنے (Divert) کا موجب بن سکتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس مشق میں درج ذیل امور کی مدد سے مزید بہتری کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

(۱) درس کے شروع میں متعلقہ آیات کا متن اور ان کا مفہوم (مفہوم القرآن کے حوالے سے) درج کیا جائے۔

(۲) تاریخی اور جغرافیائی حوالوں سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے' لیکن اس سے درس کے پیغام سے تعلق نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ اہمیت کا باعث نہیں بنتا۔ اس لئے محترم پرویز صاحب کے درس میں روانی اور تسلسل برقرار رکھنے کی وجہ سے ایسی معلومات کے درج کرنے سے احتراز مناسب رہے گا۔

(۳) جہاں کہیں نہایت مختصر وضاحت دی گئی ہے تو مناسب یہی ہے کہ وہ علیحدہ Foot Note میں درج کرنے کی بجائے متن کے ساتھ ہی بریکٹ میں درج کی جائے۔

(۴) کسی نظریہ کی مزید وضاحت کے لئے ثانوی اور خارجی حوالوں کی بجائے تحقیقی اصولوں کے مطابق اصلی ماخذ کی نشاندہی کی جائے' تو بہتر رہے گا۔

(۵) کتاب کے آغاز میں طویل انتساب' اشعار اور اقتباسات کے صفحات' اظہار تشکر اور پیش لفظ جیسے عنوانات کی بجائے بہتر یہی ہوگا کہ کتاب کے آغاز میں ایک ہی عنوان ''تعارف'' کو برقرار رکھا جائے۔ اس میں مطمحِ نظر دروس کی تفہیم میں پرویز صاحب کے اسلوب کی وضاحت کرنا مقصود ہو۔

(۶) پرویز صاحب نے جو الفاظ پنجابی زبان میں ادا کئے ہیں' ان کا اردو مفہوم متن کے ساتھ ہی بریکٹ میں

واضح کر دیا جائے' تو قاری کو Foot Note دیکھنے کی زحمت نہیں رہتی۔

(۷) اسی طرح دروس کی متعلقہ آیات کا اردو میں مفہوم کی Foot Note کے ذریعے ادائیگی بھی قاری کے لئے الجھن کا موجب بنتی ہے۔ میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوتا اگر یہ مفہوم بھی آغاز میں دی گئی آیات کے متن کے ساتھ ہی واضح کر دیا جاتا۔ ان تمام کا حوالہ بھی ایک ہی دفعہ کتاب کے تعارف میں محترم پرویز صاحب کے مفہوم القرآن کا شامل کر دیا جائے' تاکہ بار بار کے حوالے سے الجھن کا شکار ہونے سے بچت ہو جائے۔

ویسے تحقیقی اصولوں کے مطابق آیات کا ترجمہ قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے' جس میں خارجی عنصر کی اضافت نہیں ہوتی۔ یہاں البتہ مصنف ترجمہ پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے' مفہوم کی ادائیگی پر اصرار کرتے ہیں' لہٰذا بہتر ہوگا کہ ان کا نقطۂ نظر کتاب شروع کرنے سے پہلے درج کیا جائے تاکہ قاری اس کا علمی تجزیہ کر سکیں۔

اس ضمن میں محترم پرویز صاحب نے اپنے موقف کو مفہوم القرآن کے آغاز ہی میں تعارف کے عنوان میں پیش کیا ہے' جسے میرے خیال میں کتاب کے آغاز میں اسی عنوان میں سامنے رکھ دینا چاہئے۔ محترم پرویز صاحب نے اس ضمن میں واضح کیا ہے کہ:

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ' خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو' قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ:

(I) عربی زبان کی مستند کتب لغت و تفاسیر کی مدد سے' قرآن کریم کے تمام الفاظ کے معانی' پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ متعین کئے جائیں اور اس کے لئے جہاں تک پیچھے جا سکتے ہوں' جائیں' تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نزولِ قرآن یا اس سے قریب تر زمانہ میں ان الفاظ سے بالعموم کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔

(II) پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن کریم نے ان الفاظ کو کن کن معانی میں استعمال کیا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک بات کو مختلف مقامات پر بیان کرتا ہے اور ان تمام مقامات کو بیک وقت سامنے لانے سے ان الفاظ کا مفہوم نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔

(III) علاوہ ازیں' جن الفاظ کو قرآن کریم نے بطور اصطلاحات استعمال کیا ہے' ان کا مفہوم بھی قرآن کریم سے متعین کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ ان جامع اصطلاحات سے' اپنی تعلیم کے کس قسم کے تصورات (Concepts) پیش کرتا ہے۔

(IV) اس کے بعد اگلے مرحلہ میں قرآنی الفاظ

کے جو معانی اس طرح متعین کئے گئے ہیں' ان کی رو سے' آیات قرآنی کا مفہوم متعین کیا جائے' جس کی طرف امام ابن قتیبہؒ نے اشارہ کیا ہے۔ یعنی قرآنی آیات کا ترجمہ نہ کیا جائے (کیونکہ ترجمہ سے بات واضح نہیں ہوسکتی) بلکہ ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں بیان کیا جائے خواہ یہ کتنی ہی جگہ کیوں نہ گھیرے۔

محترم پرویز صاحب نے اسی عنوان میں وضاحت کی ہے کہ:

یہ مروجہ مفہوم سے اختلاف نہیں' بلکہ مروجہ مفہوم کی محدودیت کو قرآن کی وسعت سے ہمکنار کر دینا ہے۔ ان مقامات میں دیکھنا یہ چاہئے کہ جو مفہوم میں نے پیش کیا ہے' وہ ان الفاظ کے بنیادی معانی اور قرآن کریم کی کلی تعلیم کے خلاف تو نہیں۔

میرے خیال میں قرآنی آیات کا ترجمہ دینے کے بجائے مفہوم کا درج کرنے کی Justification کے لئے مصنف کی وضاحت کا تذکرہ آغاز ہی میں تعارف میں کیا جانا ضروری ہے۔ اس امر سے تحقیق کے طالب علموں کی بھی تشفی ہو جاتی ہے کہ قرآنی آیات کا ترجمہ کی بجائے مفہوم میں خارجی عنصر شامل نہیں کیا گیا بلکہ یہ انہی آیات کا مفہوم ہے جو تصریفِ آیات اور لغت کے حوالے سے مرتب کیا گیا ہے لہٰذا یہ مفہوم متن قرآن ہی کا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد صدیق بن اللہ دِتہ

﴿قندیلِ قُرآنی﴾

کہاں پر چھوڑ آئے ہم وہ اندازِ مسلمانی
تھی میرے دوست جو ہم میں محبت کی فراوانی

رہی کب کوئی ہمدردی ہمیں اس نوع انساں سے
کہ جیسے حکم اللہ کی نہ کوئی قدر ہے جانی!

نہیں جذبہ رہا ہم میں کوئی بے لوث خدمت کا
پھنسے ہیں خود فریبی میں نہ سمجھی قدر انسانی

نہ مال و جان کا سودا کیا ہے ہم نے اللہ سے
مگر ہم مفت میں ہیں چاہتے دنیا میں خوش نامی!

مرے اللہ کرنا ذکر تیرا بھول بیٹھے ہم
مگر تیرے کرم کی پھر بھی ہے لاریب ارزانی

یہی کچھ سوچ کر سر کو پکڑ کر رہ گئے تو کیا
مگر اے دل سمجھ لے' ساتھ مشکل کے ہے آسانی

رہی ہے اور رہے گی سرکشی بندوں کی بندوں پر
کہ جب ہر آنکھ سے اوجھل رہیں آداب انسانی

رہا ہے اور رہے گا دیں سیاست سے جدا لازم
کہ جب تک راہ اللہ کو نہ سمجھے نوعِ انسانی

رکھا ہے دیں سیاست سے جدا اس تنگ نظری نے
کبھی جس دین کی کرتے تھے ہم مل کر نگہبانی

بٹے ہیں فرقہ بندی میں یہ کہہ کر ہم مسلماں ہیں
کہ حکم اللہ کو چھوڑا تو ملی ہم کو پشیمانی!

مسلماں کا مسلماں ہے عدوٗ سارا جہاں سمجھا
مگر سوچا نہیں ہم نے ہے کیا فرمان لقمانی

نظر آئے گا کچھ ہم کو نہ باطل کے اندھیروں میں
کہ ہم نے پشت کے پیچھے رکھی قندیل قرآنی(۳/۱۸۷)

حساب آخرت کا ڈر ہو جب اس دار فانی میں
لرز جائے گا دل جب ہو نہ حاصل پاک دامانی

رہی ہے اور رہے گی تنگدستی ملک و ملت میں
کہ جب تک ملک میں نافذ نہ ہو قانونِ قرآنی

رہی ہے اور رہے گی حکمرانی اہل دولت کی
کہ جب تک نسل انسانی نہ چھوڑے ان کی دربانی

رہا ہے اور ہے جاگیرداری کا قیام اے دوست!
کہ جب تک ملک میں نافذ نہ ہو آئینِ ربانی!

رہیں گے فرقہ بند اس قوم کے اعصاب پر اسوار
رہیں گے حکمراں جب تک یہ قارونی و ہامانی

نظر آئے گی تجھ کو بے بسی مسجد میں اے زاہد
کہ جب اس قوم پہ نافذ نہ ہو آئینِ قرآنی!

پھریں گے ہر طرح بھٹکے ہوئے ہم دین و دنیا میں
کہ جب تک ہم نہ سمجھیں گے ہیں کیا فرمانِ قرآنی

ادب اخلاص کے درجات کو ہم پا نہیں سکتے
کہ جب تک بے حیائی میں نہ سمجھیں اپنی بدنامی

عیاذ اللہ! خون انسان کا پیتے ہیں جی بھر کے
کہ جس اوپر کے طبقے کو ہو فکرِ عیش سامانی!

بڑا احسان ہے ہم پر جو سب نبیوں نے فرمایا
کہ وہ ہے لا شریک اللہ! نہیں اس کا کوئی ثانی!

مِلے حرکت سے برکت اور خدمت سے ملے عظمت
وہی درجے میں اعلیٰ جن کی پیشانی ہے نورانی!

رہا ہے اور رہے گا ہر مصیبت کا شکار انساں
ہو جب تک روح انساں کو نہ حاصل پختہ ایمانی

رہا ہے اور رہے گا ہر کہیں دور غلامانہ
برابر ہو نہ جب تک اس جہاں میں قدرِ انسانی

رہے گا کب تلک سجدے میں روتا تو بھی اے صدیقؔ
کہ جب تیری نمازوں میں نہ ہو فکرِ جہانبانی

ہمیں یارب وہی پھر دے جو حق اپنا گنوا بیٹھے
جو دی تو نے نبوتؐ کو بنی آدم کی نگرانی

رہے گا دینِ اللہ کا ہماری آنکھ سے اوجھل
ہے جب تک فحش کا چسکا ہے جب تک ذوقِ عریانی

خلوص و صدق کو چھوڑا تو گویا چھوڑا اللہ کو
ہوئی گم سوچ دنیا میں، ہے جیسے عقل حیوانی

دلاسا کیا سنوارے گا رفاقت تیری، میری سے
کہ جب یہ قوم مرسلؐ ہو ہوس کاری کی زندانی

کبھی صدق و مروت سے جدا ہم ہو نہیں سکتے
اگر ہم نے بھی اپنی ارتقائی راہ پہچانی

اگر ہم کام اصلاحی کریں دن رات خلقت کے
تو خوشبو پھیل سکتی ہے مثالِ بوئے بُستانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدیؔ، راولپنڈی
mansoor_sarmadi@yahoo.com

شُد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرھا (آخری قسط)

(فکرِ غامدی پہ اِک نظر)

[ربطِ مضمون کے لئے جون 2007ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیے]

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتان عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

نسخ القرآن بالحدیث: سابقہ مضمون میں عرض کیا گیا تھا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت نہ تو کسی دوسری آیت کی ناسخ ہے اور نہ ہی کوئی کسی سے منسوخ۔ یہ محض ہمارے احبار اور رھبان کی کج فہمی اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا جب قرآنی آیت کسی دوسری آیت کو منسوخ نہیں کرتی تو کسی حدیث کا قرآنی آیت کو منسوخ کرنے کا نظریہ آپ سے آپ باطل قرار پاتا ہے۔ مگر اس امت کی بدقسمتی کہ اس کے فقہاء محدثین زمانہ قدیم سے اس باطل عقیدے کی آبیاری کرتے آئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ آج یہ نظریہ ملتِ بیضا کے ہاں ایک تناور درخت کی صورت جڑ پکڑ چکا ہے۔ چنانچہ امام اوزاعی کے بارے میں مشہور ہے کہ:

عن اوزاعی عن مکحول قال القرآن احوج الی السنة من السنة الی الکتاب۔

''امام اوزاعی مکحول کے اس قول کے راوی ہیں کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں''۔ (مختصر جامع بیان العلم، ص۲۲۳)۔

حدیث کے ایک اور مشہور امام، یحییٰ بن کثیر کہا کرتے تھے کہ:

''حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں''۔ (بحوالہ ایضاً)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کہیں کسی قرآنی حکم اور کسی حدیث میں تصادم آ رہا ہو تو فیصلہ حدیث کا قبول کیا جائے گا نہ کہ قرآن کا (معاذ اللہ)۔ اس باطل نظریے کے ابطال کے لئے لمبے چوڑے دلائل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو خدا کی طرف سے واضح حکم تھا کہ:

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَى إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ (۳۳/۲)۔

''جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے اس کا اتباع کرو''۔

اور خود نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنے پیروؤں کے سامنے بار بار اعلان کر دیا تھا کہ:

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَى إِلَيَّ (۱۵/۱۰'۹/۴۲)۔

''جو کچھ مجھ پر وحی کیا گیا ہے میں اس کے سوا کسی چیز کا اتباع نہیں کرتا''۔

لہٰذا یہ غیر ممکن ہے رسولِ خدا قرآنِ کریم سے ہٹ کر کوئی حکم دیں یا قرآنی حکم میں کوئی اضافہ کریں۔

امتِ مسلمہ میں ہمیشہ سے ایسے زعماء موجود رہے ہیں جنہوں نے اس باطل عقیدے کا ابطال کیا۔ برصغیر میں سرسید احمد خان مرحوم پہلے شخص تھے جنہوں نے بالبداہت اس باطل نظریے پر کاری ضرب لگائی۔

آج کل یہ چلن عام ہوتا جا رہا ہے کہ جس چیز کی مخالفت مقصود ہو پہلے اس کی عظمت و بزرگی پر ایک لیکچر دیا جائے' ہر نافرمانی سے پہلے فرماں برداری و اطاعت پہ وعظ کہا جائے' ہر اسلام کش کام کا آغاز اسلام کے اتباع کی تلقین سے کیا جائے اور اسلام کے سینہ میں ہر مرتبہ چھری گھونپنے سے پہلے قرآن کی چھاؤں میں اسلام کو از سرِ نو زندہ اور تازہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جائے۔

بالکل یہی طرزِ عمل محترم غامدی صاحب نے ''نسخ الکتاب بالسنۃ'' کے سلسلے میں اختیار کیا ہے۔ پہلے تو وہ اس عقیدے کو قطعی طور پر (Catagorically) رد کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوءِ فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے' کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے''۔ (میزان' طبع دوم' ص ۳۶)۔

کتنے خوبصورت الفاظ میں قرآنِ کریم کی محکمیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ نظر آتا ہے کہ ایسا لکھنے والا قرآنِ کریم سے غایت درجہ محبت و عقیدت رکھتا ہے۔ اسے وحیِ خداوندی کے مقام و مرتبے کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہے۔ مگر اگلی ہی سانس میں موصوف کہتے ہیں:

''قرآن کے بعض اسالیب اور بعض آیات کا موقع و محل جب لوگ نہیں سمجھ پائے تو ان سے متعلق نبی ﷺ کے ارشادات کی صحیح نوعیت بھی ان پر

واضح نہیں ہوسکی۔ اس طرح کی جتنی مثالیں بالعموم پیش کی جاتی ہیں' ان سب کا معاملہ یہی ہے''۔ (حوالہ ایضاً)۔

یہ کچھ فرمانے کے بعد موصوف نسخ القرآن بالحدیث کے ضمن میں مشہور مثالوں کو ایک ایک کر کے بیان کرتے ہوئے ان کو اپنے زعم میں قرآن ہی سے ثابت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر یہاں پر صرف دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا وہ مصلوب کر دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا پھر ان کو ملک بدر کر دیا جائے۔ یہ تو دنیا میں ان کے لئے رسوائی ہے' آخرت میں ان کے لئے عذابِ عظیم ہے''۔ (۵/۳۳)۔

اس آیت میں قرآن ان لوگوں کی سزا بیان کر رہا ہے جو کسی اسلامی حکومت میں بغاوت یا معاشرے میں بدامنی کے مرتکب ہوں۔ اس میں زنا کے مجرموں کا ذکر تو کجا' اس کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ مگر داد دیجئے ہمارے ان مفسرِ قرآن صاحب کو کہ وہ کس طرح اس میں سے زانی کے لئے رجم کا حکم ثابت کرتے ہیں: لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ نے اس حکم کا اطلاق اپنے زمانے میں زنا کے بعض عادی مجرموں پر کیا اور فرمایا: خذوا عنی' خذوا عنی' قد جعل اللہ لھن سبیلا۔ البکر بالبکر' جلد مائة و نفی سنة والشیب بالشیب جلد مائة والرجم۔ (مسلم رقم ۱۶۹۰)۔

مجھ سے لو' مجھ سے لو' زنا کی ان عادی عورتوں کے بارے میں اللہ نے جو راہ نکالنے کا وعدہ کیا تھا' وہ اس نے نکال دی ہے۔ اس طرح کے مجرم اگر کنوارے یا الھڑ ہوں تو ان کی سزا سو کوڑے اور جلاوطنی ہے اور رنڈوے یا شادی شدہ ہوں تو سو کوڑے اور سنگ ساری ہے''۔ (میزان' طبع دوم' ص ۴۲۔۴۱)۔

صحیح مسلم کی یہ روایت کئی لحاظ سے محلِ نظر ہے۔ اولاً' اس میں محاربہ یا فساد فی الارض کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ثانیاً' یہ کنوارے اور شادی شدہ زانی کے لئے مختلف سزائیں بتا رہی ہے جو کہ قرآنی تعلیمات سے متصادم ہے۔ ثالثاً' رجم کے پہلو بہ پہلو سو کوڑوں کی سزا کا ذکر بھی کیا گیا جو کہ نہ تو مبنی برانصاف ہے نہ ہی تعلیماتِ قرآن سے ہم آہنگ۔ بلاشبہ برطانوی فوجداری قوانین میں ایسے نظائر موجود ہیں مگر قرآنِ کریم سے اس طرح کی ایک بھی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ ایک جرم کے لئے موت کی سزا کے

ساتھ ساتھ کوئی دوسری سزا بھی بیان کی گئی ہو۔

رجم یا سنگساری کی سزا شادی شدہ زانی کے لئے بیان کی جاتی ہے مگر موصوف نے اسے بڑے ادعا کے ساتھ محاربہ اور فساد فی الارض کے ساتھ جوڑنے کی سعی کی ہے' لکھتے ہیں:

''آپ کا منشاء یہ تھا کہ یہ عورتیں چونکہ محض زنا ہی کی مجرم نہیں ہیں بلکہ اس کے ساتھ آوارہ منش اور جنسی بے راہ روی کو اپنا معمول بنا لینے کی وجہ سے فساد فی الارض کی مجرم بھی ہیں' اس لئے ان میں سے جو اپنے حالات کے لحاظ سے رعایت کی مستحق ہیں' انہیں زنا کے جرم میں سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۲ کے تحت سو کوڑے اور معاشرے کو ان کے فساد سے بچانے کے لئے ان کی اوباشی کی پاداش میں مائدہ (۵) کی آیت ۳۳ کے تحت نفی' یعنی جلاوطنی کی سزا دی جائے۔ اسی طرح جنہیں کوئی رعایت دینا ممکن نہیں ہے وہ اس آیت کے حکم 'ان یقتلوا' کے تحت رجم کر دی جائیں''۔ (بحوالہ ایضاً)۔

یہ اقتباس قارئین کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کوئی بزعم خویش مفسر قرآن اگر تعلیماتِ قرآنی کو مسخ کرنے پر اتر آئے تو قرآن کا نظم و ترتیب اور تصریفِ آیات کس طرح اس کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں' یہ اقتباس از اول تا آخر' اسی کا غماز ہے۔ جس چیز کو یہاں رسول اللہ ﷺ کا منشاء بتایا جا رہا ہے' اوپر بیان کی گئی صحیح مسلم کی روایت میں اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ روایت کے ترجمے میں بھی موصوف نے ''زنا کی عادی'' کے الفاظ اپنے نہاں خانۂ دماغ سے اخذ کر لیے ہیں۔ متن میں وہ الفاظ سرے سے موجود ہی نہیں۔

اس آخری اقتباس میں کہا گیا ہے کہ جو خواتین اپنے حالات کے لحاظ سے رعایت کی مستحق ہوں انہیں سو کوڑے مارے جائیں۔ سورۂ نور کی جس آیت سے یہ استنباط کیا گیا ہے وہ صرف زانیہ کے لئے نہیں بلکہ زانی کے لئے بھی سزا بیان کرتی ہے۔ موصوف نے اسے محض عورتوں سے متعلق بتایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب کے نزدیک خواتین ہی اصل مجرم ہیں اسی لئے تو مردوں کے لئے خاص طور پر فرماتے ہیں کہ:

''آدمی آبرو باختہ اور بدچلن ہے تو ثبوتِ جرم کے لئے ان میں سے ہر چیز بڑی اہمیت کی حامل ہے لیکن اس کی شہرت اگر شریف اور پاک دامن شخص کی ہے تو قرآن یہی چاہتا ہے کہ اس سے اگر کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اس پر پردہ ڈال دیا جائے اور اسے معاشرے میں رسوا نہ کیا جائے''۔ (میزان' طبع دوم' ص ۳۰۴)۔

یہ شاید مرد کے معاشرے (Male

(Dominated Society) میں تربیت پا کر بڑے ہونے کا اثر ہے کہ مفسر قرآن کی تحریروں سے ''مردانہ تعصب'' (Male Chauvinism) کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ سورۂ نور میں سو کوڑوں کی سزا بیان کرتے ہوئے قرآن نے کسی نرمی یا رُو رعایت سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔

''اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو اللہ کے دین کے نافذ کرنے میں ان دونوں کے ساتھ کسی نرمی یا رُو رعایت کا جذبہ تمہارے دامن گیر نہ ہو پائے''۔ (۲۴/۲)۔

مگر غامدی صاحب کا فرمانا ہے کہ سو کوڑوں کی سزا انہیں دی جائے گی جو عورتیں حالات کے لحاظ سے رعایت کی مستحق ہیں اور آخر میں موصوف کی تان یہاں آ کر ٹوٹتی ہے کہ جن عورتوں کو کوئی رعایت دینا ممکن نہ ہو انہیں سنگ سار کر دیا جائے۔ اس طرح سے وہ اپنے زعم میں یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی سزا قرآن سے ثابت ہے۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ کس طرح قرآن کریم کے دو مختلف احکام کو زبردستی آپس میں مدغم کر کے خلط مبحث کا اظہار کیا گیا ہے۔ محاربہ اور فساد فی الارض کی سزا ایک طرح کے جرم یعنی بغاوت و بدامنی وغیرہ کے لئے ہے جبکہ سو کوڑوں کی سزا دوسری طرح کے جرم یعنی زنا کے لئے۔ اول الذکر جرم کے ارتکاب کے بعد اگر باغی یا مفسدین فی الارض تائب ہو جائیں تو حکومت کو ہدایت کی گئی ہے کہ سزا دینے سے اجتناب کریں۔ پوری آیۂ محاربہ یوں ہے:

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا مصلوب کر دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا پھر ان کو ملک بدر کر دیا جائے۔ یہ تو دنیا میں ان کے لئے رسوائی ہے۔ آخرت میں ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔ مگر جو لوگ قابو پائے جانے سے پہلے توبہ کر لیں تو جان رکھو کہ اللہ بخشندہ و مہربان ہے''۔ (۵/۳۳۔۳۴)۔

دیکھ لیجئے، قرآنِ کریم کا اسلوب اور نظم اس سے اِبا کرتا ہے کہ ایک طرح کے جرم کے لئے دوسری طرح کے جرم کی سزا دی جائے۔ دنیاوی حکومتوں کے خلاف بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں اور انہیں کبھی سختی سے اور کبھی چشم پوشی سے نپٹایا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کے باغیوں کے لئے بھی یہی اصول مقرر کیا گیا ہے۔ خاص طور جو لوگ اپنی غلطی کا احساس کر لیں اور آئندہ کے لئے تائب ہو جائیں ان سے درگذر کرنے کا کہا گیا ہے۔ یہ آیۂ محاربہ ہے۔ لیکن اگر جرم

زنا کی سزاؤں کو اس میں زبردستی گھسیڑ دیا جائے تو سخت مشکل پیش آئے گی۔ زنا کا جرم ایسا نہیں ہے کہ مجرمین اگر تائب ہو جائیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ یہ محض دو لوگوں کا آپس کا معاملہ نہیں ہے' بلکہ صالح معاشرے کی بقا کا مسئلہ ہے۔ ہمارے اس ملک میں انفرادی اور اجتماعی آبروریزی (Gang Rape) کے واقعات اب عام ہوتے جا رہے ہیں۔ اب ظلم و درندگی کی شکار خواتین لاکھ احتجاج کریں' FIR لکھوائیں یا عدالتوں میں رجوع کریں' موصوف کے وضع کردہ قانون کی رو سے پولیس والے جب کسی مجرم کے گھر پہنچیں گے تو وہ فرار ہونے کی بجائے کمال اطمینان سے کہے گا کہ 'صاحب! آپ نے ناحق آنے کی تکلیف فرمائی' ہم تو کب کے توبہ کر چکے ہیں' اس مثال سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنی قوانین ہر قسم کے سقم سے منزہ ہوا کرتے ہیں جبکہ انسان کے بنائے ہوئے خود ساختہ (Man-made) قوانین ایک طرف تو انسانیت کو فائدہ پہنچانے کی بجائے الٹا نقصان کا باعث بنتے ہیں دوسری طرف دنیا کی نظروں میں اسلام کو اضحوکہ بنا دیتے ہیں۔

ضمناً' آیۂ محاربہ میں 'یقتلوا' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی قتل کیے جانے کے ہیں۔ اس سے لازمی طور پر رجم کرنے کا معنی کیسے لیا جا سکتا ہے؟

رجم یا سنگساری کی سزا نسخ الکتاب بالسنۃ کی ایک مثال ہے۔ قرآنِ کریم نے شادی شدہ یا غیر شادی شدہ کی تخصیص کیے بغیر زنا کی سزا سو درے مقرر فرمائی ہے۔ وضعی احادیث اور مسخ شدہ تاریخ کے بل پر رجم کو بھی شریعت میں داخل کر دیا گیا مگر خدا نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ایسا عجیب وغریب بندوبست کیا ہے جس کی وجہ سے قرآنِ کریم کے مخمل میں وضعی روایات کے ٹاٹ کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔ اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرے بھی تو فوراً اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں زنا کی سزا سے متعلق دو مقامات ایسے ہیں کہ ان کو اگر پیشِ نظر رکھا جائے تو رجم کا فسانہ کبھی بار نہیں پا سکتا۔ پہلا مقام سورۂ نساء کی آیت ۲۵ ہے جہاں قرآن نے بتایا ہے کہ شادی شدہ لونڈی کی سزا محصنٰت کی سزا کی بہ نسبت نصف ہے' آیت یوں ہے۔

فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ (۴/۲۵)۔

محصنٰت کا ایک معنی 'شادی شدہ عورتیں' ہے۔ اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر شادی شدہ عورت کی سزا رجم ہے تو لونڈی کے لئے اس کا نصف کیا ہوگا؟ رجم کا نصف کیسے کیا جائے گا؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ یہاں محصنٰت سے شادی شدہ عورتیں مراد نہیں ہے بلکہ آزاد کنواری عورتیں مراد ہیں۔ اگر اس تاویل کو مانا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شادی شدہ لونڈی کی سزا آزاد کنواری عورت کی سزا (یعنی سو درے) کا نصف ہے تو پھر

غیر شادی شدہ لونڈی کی شرعی سزا کیا ہوگی؟ اب چونکہ رجم والی مشکل کی وجہ سے کوئی سزا بچتی ہی نہیں کہ جس کا نصف ہو سکے تو فرمایا جاتا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیہ لونڈی پر سرے سے کوئی حد ہی نہیں ہے۔ تائید میں حضرت ابنِ عباس کی زبانی یہ تفسیر پیش کر دی جاتی ہے:

عن ابن عباس ان الامة اذا زنت قبل ان تحصن انه لا حد عليها۔

''حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ لونڈی اگر شادی سے پہلے زنا کی مرتکب ہوگی تو اس پر کوئی حد نہیں ہے۔'' (احکام القرآن للجصاص' جلد۳' ص ۳۱۵)۔

قارئین کرام اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو زنا کی سزا کو اتنا سخت بتایا جا رہا ہے کہ کوڑوں کے قرآنی حکم پر اضافہ کر کے مجرموں کو سنگسار کر کے جان سے مارا جا رہا ہے اور دوسری جانب اتنی چھوٹ کہ معاشرے میں بلا روک ٹوک پھرنے والی غیر شادی شدہ لونڈیوں کو زنا کی کھلی چھٹی دی جا رہی ہے۔ دینِ اسلام کو ایسی ہی تاویلات نے مہذب دنیا کے سامنے اضحوکہ بنا کے رکھ چھوڑا ہے۔

قرآن کریم کا وہ دوسرا مقام جو رجم کے ابطال کی ایک روشن دلیل ہے سورۂ احزاب کی آیت ۳۰ ہے۔ حضورﷺ کی بیویوں کو مخاطب کر کے ایک اِمکانی صورتِ حال پیش کی گئی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

يَا نِسَاء النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيراً (۳۳/۳۰)۔

''اے نبی کی عورتو! تم میں سے جو کوئی بھی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوگی اس کی سزا دگنی ہوگی' ایسا کرنا اللہ کے لئے آسان ہے''۔

یہ محض ایک تنبیہ تھی وگرنہ ازواج رسولﷺ کا مقام و مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ان سے اس طرح کی کوئی حرکت سرزد ہونا محال ہے۔ اس سے بہرحال یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی سزا ہے تو پھر اس کا دگنا کیا ہوگا؟ قرآن کے ان دونوں مقامات سے واضح ہو جاتا ہے کہ زانی (خواہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کی سزا ایسی ہے جس کا نصف بھی ممکن ہے اور دوگنا بھی اور یہ بالبداہت وہی سو کوڑوں کی سزا ہے۔ رجم کا نہ تو نصف کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی دگنا۔ رجم کو قرآنی حکم ثابت کرنے کے لئے یہ ہے غامدی صاحب کے دلائل کی کل کائنات! اس میں سے صاحبانِ فکر و تحقیق اگر چاہیں تو بہت کچھ لولوئے لالا جمع کر سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے حکم میں ایک وضعی روایت کے ذریعے ایک واضح ترمیم کر دینے کے بعد موصوف کمال ''سادگی'' سے فرماتے ہیں:

''نبیﷺ کا یہ ارشاد بھی قرآن کے مدعا میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں کرتا''۔ (میزان' طبع ۲۰۰۲' ص

۴۲)۔

؎ اس 'سادگی' پہ کون مر نہ جائے اے خدا
کرتے ہیں قتل ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اب آپ کے سامنے نسخ القرآن بالحدیث کی ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔ سورۂ نساء میں جہاں ان رشتوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے' وہاں آخر میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَأَن تَجْمَعُواْ بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلاَّ مَا قَدْ سَلَفَ إِنَّ اللّهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً (۴/۲۳)۔

''اور (یہ بھی جائز نہیں کہ) تم دو بہنوں کو نکاح میں اکٹھا کرو مگر جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔ بے شک اللہ بخشندہ و مہربان ہے''۔

وضعی روایات کی رو سے کہا جاتا ہے کہ اس فہرست میں اضافہ کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ پھوپھی' بھتیجی اور خالہ' بھانجی کو بھی ایک نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔ مگر موصوف چونکہ نسخ القرآن بالحدیث کو بظاہر تسلیم نہیں کرتے' دیکھئے کہ اس باب میں وہ کیا کہتے ہیں' لکھتے ہیں:

''زن و شو کے تعلق میں بہن کے ساتھ بہن کو جمع کرنا اگر اسے فحش بنا دیتا ہے تو پھر پھوپھی کے ساتھ بھتیجی اور خالہ کے ساتھ بھانجی کو جمع کرنا بھی گویا ماں کے ساتھ بیٹی ہی کو جمع کرنا ہے۔ لہٰذا قرآن کا مدعا' لاریب یہی ہے کہ ان تجمعو بین الاختین و بین المراۃ و عمتھا و بین المراۃ و خالتھا۔ وہ یہی کہنا چاہتا ہے لیکن 'بین الاختین' کے بعد یہ الفاظ اس نے اس لیے حذف کر دیے ہیں کہ مذکور کی دلالت اپنے عقلی اقتضاء کے ساتھ اس محذوف پر ایسی واضح ہے کہ قرآن کے اسلوب سے واقف اس کا کوئی طالب علم اس کے سمجھنے میں ہرگز غلطی نہیں کر سکتا''۔ (میزان' طبع دوم' ص۴۰)۔

جب ائمہ فقہ' روایات' اور اسلاف کا موقف غامدی صاحب کے مفید مطلب ہو تو وہ مخالف پر حجت تمام کرنے کے لئے اسے بڑی تفصیل اور حوالوں سے نقل کر کے ثبوت کے گویا انبار لگا دیتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں ان کی کتاب 'برہان' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جب اسلاف کا موقف ان کے خلاف جاتا ہو تو بھولے سے بھی اس کا نام نہیں لیتے بلکہ اس طرح کے مہمل جملوں کو اپنی تائید میں پیش کر دیتے ہیں جیسے:

۱۔ قرآن پر تدبر کرنے والے کسی صاحب علم سے اس کا یہ منشاء کسی طرح مخفی نہیں رہ سکتا۔ (میزان' ص۴۰)۔

۲۔ قرآن کے اسلوب سے واقف اس کا کوئی طالب علم اس کے سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ (حوالہ ایضاً)۔

۳۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے انہوں نے اسے بیان

فطرت کی بجائے بیان شریعت سمجھا۔ (ایضاً ص ۳۸)۔

۴۔ عربیت کے اداشناس جانتے ہیں کہ..... (ایضاً ص ۲۸۴) وغیرہ۔

موصوف نے اس اقتباس میں فرمایا ہے کہ قرآنی اسلوب سے واقف اس کا کوئی طالب علم اس محذوف جملے کو سمجھنے میں کبھی غلطی نہیں کرسکتا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ مودودی صاحب جو موصوف کی نظر میں قرآن کے اسلوب سے واقف، محض ایک طالب علم ہی نہیں بلکہ ''دین کے ایک جید عالم'' تھے (ماہنامہ اشراق ۱۹۹۳ء فروری، ص ۵۳)، پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو ایک نکاح میں جمع نہ کرنے کے حکم کو قرآنی محذوف سمجھتے ہیں یا اسے سیدھا سیدھا پیغمبرؐ کا حکم سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں کو بہ یک وقت نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا (النساء۔ ۲۳)۔ نبی ﷺ نے بتایا کہ پھوپھی، بھتیجی اور خالہ بھانجی کو جمع کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے''۔ (ص ۷۷۔۷۶)۔

اسی کتاب میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''قرآن نے جب ایک عورت کو اس کی بہن کے ساتھ نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا تو اس سے مقصود محبت کے اس تعلق کی حفاظت کرنا تھا جو بہن اور بہن کے درمیان فطرتاً ہوتا ہے اور عملاً ہونا چاہئے۔ نبی ﷺ نے بتایا کہ یہی علت باپ کی بہن اور ماں کی بہن کے معاملے میں بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو بھی نکاح میں جمع کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔ یہ خواہ تشریحِ تعبیر ہو، یا استنباط یا تشریع، بہرحال خدا کے رسول ﷺ کا حکم ہے''۔ (سنت کی آئینی حیثیت، طبع ۲۰۰۵ء، ص ۱۷۳۔۱۷۲)۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے، کہ مودودی مرحوم بھی اسے قرآنی محذوف ماننے کی بجائے رسول اللہ ﷺ کا حکم فلہٰذا النسخ الکتاب بالسنہ تسلیم کرتے تھے۔ اس معاملے میں غامدی صاحب کے لئے حجت چونکہ ان کا اپنا 'شرح صدر' ہی ہے جس کے ماتحت انہوں نے مذکورہ محذوف الفاظ اپنے صحیفۂ دل سے پڑھ کر اس امت پر منکشف کر کے امت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زیرِ بارِ احسان کر دیا ہے، لہٰذا ہمارے لئے اس باب میں خامشی ہی بہتر ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآنی محذوفات کا معاملہ ایسا کچھ الل ٹپ نہیں ہے کہ جو شخص چاہے اٹھ کر اپنی افتادِ طبع سے جس چیز کو چاہے محذوف قرار دے دے، قرآن کے الفاظ اور سیاق کلام خواہ کتنا ہی اس سے انکار کر رہے ہوں۔ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب اسے کسی بات کو متعین طور پر پیش کرنا ہو تو وہ اشارات، کنایات یا محذوفات سے

کام نہیں لیتا' اسے واضح' غیر مبہم اور متعین (Specific) انداز سے بیان کرتا ہے۔

حذف کا اسلوب دنیا کی تمام اہم زبانوں میں پایا جاتا ہے اور اسے بالعموم تکرار کی کلفت سے بچنے کے لئے اپنایا جاتا ہے۔ اسے سمجھنے میں ماہرینِ لسانیات تو ایک طرف' ایک عام فہم آدمی کو بھی غلطی نہیں ہوسکتی۔ قرآنِ کریم نے بھی بعض مقامات پر حذف سے کام لیا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے یہاں صرف ایک ہی مثال پیش کی جاتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے برادران جب دوسری مرتبہ غلہ لے کر مصر سے روانہ ہونے لگتے ہیں تو چھوٹے بھائی کی بوری سے چوری کا پیالہ برآمد ہوتا ہے اور اسے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ برادرِ کلاں کہتا ہے کہ میں تو واپس نہیں جا سکتا کیونکہ باپ نے مجھ سے پکا وعدہ لیا تھا کہ یوسف کے حقیقی بھائی کو واپس اس کے پاس لے کر آؤں گا۔ اس کے بعد قرآن کریم میں اس کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

ارْجِعُواْ إِلَى أَبِيكُمْ .....وَإِنَّا لَصَادِقُونَ o (۱۲/۸۱۔۸۲)۔

''تم لوگ اپنے باپ کے پاس جاؤ اور کہو کہ اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی اور ہم وہی بات کر رہے ہیں جو ہمیں معلوم ہوئی اور ہم غیب کے نگہبان نہیں ہیں اور تو اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لے جہاں ہم تھے اور اس قافلہ والوں سے پوچھ لے جن کے ساتھ ہم آئے ہیں اور ہم بالکل سچے ہیں''۔

اس کے بعد کے یہ الفاظ کہ: (بڑے بھائی سے یہ ہدایات پا کر باقی بھائی قافلے کے ہمراہ واپس اپنے باپ جنابِ یعقوبؑ کے پاس آئے۔ والدگرامی نے پوچھا کہ برادرِ خورد کو کیوں نہیں لائے تو انہوں نے جواب دیا کہ ابا جان آپ کے بیٹے نے چوری کی تھی اس لیے اسے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ آپ اس امر کی تصدیق اس بستی والوں سے کر سکتے ہیں جہاں ہم تھے اور اس قافلہ والوں سے بھی پوچھ سکتے ہیں جس کے ساتھ ہم آئے ہیں' ہم بالکل سچ بول رہے ہیں)۔

قرآنِ کریم قوسین میں درج شدہ پوری عبارت کو حذف کر دیتا ہے اور بڑے بھائی کے اس کلام کے فوراً بعد جو سرزمین مصر میں ہو رہا تھا' جناب یعقوبؑ کا جواب درج کرتا ہے جو بیٹوں کے ایک طویل سفر کے بعد سرزمینِ وطن میں دیا گیا۔ قرآن اس سے اگلی آیت میں بتاتا ہے کہ:

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْراً فَصَبْرٌ جَمِيلٌ (۱۲/۸۳)۔

''(جنابِ یعقوب نے) کہا کہ یہ بات تم نے اپنے دل سے تراش لی ہے پس میں تو صبرِ جمیل ہی سے کام لوں گا''۔

غور فرمائیے 'انا لصدقون' پر بڑے بھائی کا کلام ختم ہوتا ہے اور 'قال بل سولت' کے الفاظ

سے حضرت یعقوبؑ کا کلام شروع ہوتا ہے۔ درمیانی پورا واقعہ جو اوپر قوسین میں لکھا گیا ہے' محذوف ہے۔ آپ حذف کی یہ قرآنی مثال کسی بھی سلیم العقل شخص کے سامنے پیش کیجئے' وہ بلا تامل اسے حذف تسلیم کر لے گا۔ مگر پھوپھی' بھتیجی اور خالہ' بھانجی کے جن الفاظ کو موصوف محذوف قرار دے کر خواہی نخواہی امت کے حلق سے اتارنے پر تلے ہوئے ہیں' انہیں سوائے اپنے 'شرحِ صدر' کے کسی کی تائید بھی حاصل نہیں' حتیٰ کہ ان کے ممدوح جناب مودودی صاحب کی بھی نہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں امام اوزاعی اور یحییٰ بن کثیر کے اقوال' جو قرآن پر حدیث یا سنت کی برتری سے متعلق تھے' درج کیے گئے ہیں۔ قارئین کرام انہیں ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے۔ ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ گذرے زمانے کی باتیں ہیں' آج کل کوئی یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ مگر ایسا سمجھنا محض فریبِ نفس ہوگا۔ چنانچہ غامدی صاحب 'سنت' کی خود ساختہ' عجیب وغریب اور خانہ ساز تعریف بیان کر کے ببانگ دہل کہتے ہیں کہ:

''سنت قرآن کے بعد نہیں' بلکہ قرآن سے مقدم ہے''۔ (میزان' طبع ۲۰۰۲' ص ۵۲)۔

اور اس پر مستزاد ان کا وہ بیان جو پہلے گذر چکا ہے' کہ حدیث سے قرآن کا نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص محض سوءِ فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی۔ اس کھلی ہوئی تضاد بیانی اور ژولیدہ فکری پر اس کے سوا کیا کہا جائے۔

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے

علامہ حافظ محمد ایوب نے چند عشرے پیشتر اپنے کتابچہ ''فتنۂ انکارِ حدیث'' میں بغیر لگی لپٹی رکھے اعلان کیا تھا کہ:

''نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے.....اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ .....الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ (۲/۱۸۰)۔ ''تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا وصية للوارث۔ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسول' قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا''۔ (ص ۸۵)۔

یہ ہے وہ عقیدہ جس نے خدا کی آخری کتاب کو امتِ مسلمہ میں ایک عضوِ معطل بنا کے رکھ چھوڑا ہے جس کے بعد قرآنِ کریم بلا سوچے سمجھے تلاوت کرنے اور چوم چام کر غلافوں میں لپیٹ کر طاقِ نسیاں کی زینت بنا دینے کی چیز

بن کر رہ گیا۔ عمل کے لئے امتِ مسلمہ کی نگاہیں' عرصہ ہوا' قرآن کی طرف نہیں اٹھتیں اور یہ سارا کیا دھرا موصوف اور ان جیسے دوسرے احبار و رہبان کا ہے جن کے متعلق حکیم الامت نے خبردار کرتے ہوئے کہا تھا:

بے نصیب از حکمتِ دین نبی
آسمانش تیرہ از بے کوکبی
از شگرفی ہائے آں قرآں فروش
دیدہ ام روح الامیں را در خروش

ضمناً' غامدی صاحب نے لا وصیّۃ لـــلـــوارث کی حدیث کا ذکر اپنی پیش کی گئی مثالوں میں نہیں کیا ہے۔ معلوم نہیں اسے بھی وہ آیتِ وصیۃ (۲/۱۸۰)۔ میں محذوف مانتے ہیں یا کسی غیر متعلق آیت کے ساتھ اسے زبردستی جوڑ کر مطلوبہ نتیجہ برآمد کرتے ہیں۔

موصوف اپنی تحریروں میں جا بجا علامہ حمیدالدین فراہی مرحوم کا ذکر بڑی عقیدت و احترام سے کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اسی مکتبۂ فکر سے منسلک کرتے ہیں۔ دیکھئے کہ فراہی صاحب موضوعِ پیشِ نظر سے متعلق کیا عقیدہ بیان کرتے ہیں' آپ لکھتے ہیں:

''میں نے صحاح میں بعض ایسی احادیث دیکھیں جو قرآن کا صفایا کر دیتی ہیں۔ ہم اس عقیدے سے پناہ مانگتے ہیں کہ کلامِ رسول' کلام خدا کو منسوخ کر سکتا ہے''۔ (نظام القرآن۔ از حمیدالدین فراہی)۔

اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا اپنے آپ کو 'فراہی مکتبِ فکر' سے منسلک کرنا اصل میں لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔ اسے دوسرے الفاظ میں لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونا کہتے ہیں۔ فراہی صاحب' سرسید احمد خان کے قائم کردہ علی گڑھ کالج کے گریجویٹ تھے۔ آپ ایک روشن خیال عالم دین اور قرآن کی محکمیت کے داعی اور مبلغ تھے۔ غامدی صاحب اٹھتے بیٹھتے انہی کا نام جپتے ہیں اور اسی بہانے اپنا علمی قد و کاٹھ بڑھانے کی ناکام کوشش میں لگے رہتے ہیں ؎

حکایتِ قدِ آں یارِ دل نواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

حکمت کی باتیں

(۱) (سقراط) مجھے بس دور سے کوئی کتاب دکھادو اور پھر ساری دنیا میں لئے پھرو۔

(۲) ایک بلند و قابلِ قدر مقصد میں ناکام رہنا بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔

(۳) دولتمند اور سوداگر صرف سمجھتے ہی ہیں کہ وہ کام کر رہے ہیں' حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔

(۴) جس شخص کو کسی چیز کی آرزو نہ ہو' اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔

(۵) بصیرت اور تنقید کی قوت ذہن میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بصارت جواب دینے لگ جاتی ہے۔

(۶) (لاک) جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے' وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے۔

(۷) (برگساں) عقل ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے' جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہتے ہیں' تو وہ اس بلند سطح کے متعلق ممکنات کا سراغ دے سکے تو شاید' ورنہ وہ حقیقت کا پتہ تو کسی صورت میں دے ہی نہیں سکتی۔

(۸) (جوڈ) حقیقت یہ ہے کہ ہم جن علوم کو استدلالی کہتے ہیں' ان کی اصل و بنیاد غیر استدلالی ہوتی ہے۔

(۹) (افلاطون) اربابِ فکر عقل کے تجرباتی طریقے سے کچھ بنائیں گے' اسے پھر مٹا دیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان' خدائی راستوں سے ہم آہنگ کر لیں۔

(۱۰) ہم بہت سی باتوں کو دوسروں کی سند سے مانتے ہیں' دیکھنے کا کام یہ ہے کہ ان میں سے کونسا معقول ہے۔

(۱۱) سائنسی قوانین درحقیقت خدا کی عادات کا پتہ دیتے ہیں۔

(۱۲) جھوٹ سے دوسروں کو فریب دیا جاتا ہے لیکن بے ایمانی میں اپنے آپ کو فریب دیا جاتا ہے۔

(۱۳) (سارتر ے) جب کوئی شخص فیصلہ کرتا ہے تو یہ فیصلہ تمام دنیا کے لئے ہوتا ہے۔

(۱۴) اقدار کے حصول کی کوشش ہی زندہ رہنے کے مترادف ہے۔

(۱۵) انسان اس چیز کا ذمہ دار نہیں جس کا وہ خود سبب نہ ہو۔

(۱۶) جبلت صرف اپنے جسم کے اوزاروں سے کام لینا جانتی ہے اور شعور جسمانی اوزاروں سے الگ مادی اوزار بنانا اور انہیں استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔

(۱۷) (باردیو) یہ عقیدہ کہ خدا نے انسان کو اپنی حمد و ستائش کے لئے پیدا کیا ہے' انسانیت کے لئے ذلت اور خود خدا کے شایانِ شان نہیں۔

(۱۸) (سیمویل) انسان کو قوتِ ارادہ عطا کی گئی ہے جس سے وہ اپنے رجحانات و میلانات پر ضبط بھی رکھ سکتا ہے۔

(۱۹) (برگسان) ہم بڑی حد تک وہی ہوتے ہیں جو کچھ ہم کرتے ہیں اور اس طرح مسلسل اپنی تخلیق کرتے رہتے ہیں۔

(۲۰) حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرت کو متاثر کرتا ہے فطرت انسان کو متاثر نہیں کرتی۔

(۲۱) (دوستوفسکی) اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

(۲۲) ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔

(۲۳) جس طرح ازمنہ مظلمہ میں مذہب کے نام پر انسانی خون بہایا جاتا تھا' آج انسانی جانیں وطنیت کے دیوتا کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔